اسلام
انسانی حقوق کا پاسبان

مولانا سیّد جلال الدین عمری

ترتیب

بنیادی تصورات

فرد کے شخصی اور ذاتی حقوق

بنیادی ضروریات کی تکمیل کا حق

سماجی و معاشرتی حقوق

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

دفاع کا حق

مذہب کی آزادی کا حق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طبع سوم

'اسلام- انسانی حقوق کا پاسبان' کی یہ تیسری اشاعت ہے جو کسی قدر نظرِ ثانی کے بعد پیش کی جا رہی ہے۔ اس کا انگریزی، ہندی، تلگو، تمل اور کنڑ میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ راقم نے ایک موقع پر اس کتاب کی تلخیص 'اسلام اور انسانی حقوق' کے عنوان سے پیش کی تھی۔ اس کے کتابچہ کی شکل میں تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ میری ایک اور کتاب 'کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں' بھی اسی موضوع پر ہے۔ اس میں موضوع کے بعض گوشے زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ اس کا انگریزی اور ہندی ترجمہ بھی دست یاب ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حقیر خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور تاحیات اس کے دین کی مزید خدمت کی توفیق عنایت فرمائے۔

جلال الدین عمری

۹/اگست ۲۰۱۶ء

پیش لفظ

اس دنیا میں جو انسان پیدا ہوتا ہے کچھ حقوق لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن دنیا نے یہ حقوق کبھی اسے دیے اور کبھی وہ ان سے محروم رہا۔ کسی کو ان حقوق کا نہ ملنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ان ہی سے اس کی عظمت اور ترقی وابستہ ہے۔ یہ اسے رفعت اور بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ اس سے چھن جائیں تو وہ ذلت اور پستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور اس کی ترقی کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ حقوق کیا ہیں اور کیا سب انسانوں کے یکساں حقوق ہیں یا ان کے درمیان فرق ہے؟ یہ حقوق کیسے حاصل کیے جائیں اور ان کے تحفظ کی کیا صورت ہے؟ موجودہ دور میں یہ سوال، بعض تاریخی اسباب کی بنا پر، پوری فضا میں گشت کر رہا ہے اور ہر طرف اس کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ مختلف ملکوں میں ان حقوق کی صورتِ حال دیکھی جاتی ہے، اس کا جائزہ اور نقد و احتساب ہوتا ہے، سماج میں ان کا شعور پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے، قانون اور عدالت کے ذریعہ ان کی حفاظت کے اقدامات کیے جاتے ہیں، اس کے لیے سماجی، معاشی اور سیاسی قوت بھی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ ان کوششوں کی اہمیت اور قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات ان کے بہتر نتائج بھی دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ سوال بھی بار بار پوری شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ یہ کوششیں کس حد تک غیر جانب دار اور تعصب و تحزب سے پاک ہیں؟ عالمی سطح پر حقوق کے نگراں ان کوششوں کو دوسروں کے حقوق کی پامالی کا بہانہ تو نہیں بنا رہے ہیں؟

حقوق انسانی کے سلسلہ میں اسلام کا تصور بہت ہی واضح اور اس کا کردار بالکل نمایاں ہے۔ اس نے فرد اور جماعت اور مختلف سطح کے افراد اور طبقات کے حقوق کا تعین کیا اور عملاً یہ حقوق فراہم کیے۔ جن افراد اور طبقات کے حقوق ضائع ہو رہے تھے ان کی

نصرت و حمایت میں کھڑا ہوا اور جو لوگ ان حقوق پر دست درازی کر رہے تھے ان پر سخت تنقید کی اور انھیں دنیا اور آخرت کی وعید سنائی، معاشرہ کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کی تعلیم و ترغیب دی اور ہم دردی و غم گساری کی فضا پیدا کی۔

قرآن مجید انسانی حقوق کی ان کوششوں کی اساس ہے اور احادیث میں ان کی قولی و عملی تشریح موجود ہے۔ قرآن و حدیث کا اندازِ بحث و نظر مروّجہ قانونی کتابوں کا سا نہیں ہے۔ قانون کی کتابیں حقوق کا دفعہ وار ذکر کرتی اور حسب ضرورت ان کی تشریح کرتی ہیں۔ قرآن مجید کا طرزِ گفتگو اخلاقی بھی ہوتا ہے اور قانونی بھی۔ وہ جب اخلاق کا ذکر کرتا ہے تو ادائے حقوق کو سیرت و اخلاق کے لازمی تقاضے اور اعلیٰ کردار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی ستائش اور تعریف کرتا ہے جو ہر ایک کا حق ادا کرتے ہیں اور انھیں دنیا اور آخرت میں فلاح و کام رانی کی بشارت دیتا ہے اور جہاں ظلم و ستم اور حقوق کی پامالی ہو وہ اس کے سنگین نتائج سے آگاہ کرتا اور اس پر جہنم کی وعید سناتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان حقوق کا قانونی الفاظ میں بھی ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی حق کا ایک ہی جگہ ذکر کرے، اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کا ایک پہلو ایک جگہ اور دوسرا پہلو دوسری جگہ بیان کرتا ہے۔

احادیث کا بھی یہی انداز ہے۔ اس لیے کسی حق کو جاننے کے لیے پورے قرآن اور ذخیرۂ حدیث کو دیکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے فقہاء کرام اور ماہرین شریعت نے تفصیل سے اس پر غور کیا ہے اور حقوق کے تعین کی، اپنے دور کے حالات و ظروف کے لحاظ سے کوشش کی ہے۔ اسلامی قانون کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اس عاجز کو اس موضوع سے ایک عرصے سے دل چسپی رہی ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں پر اس کی تحریریں شائع ہوچکی ہیں۔ پیش نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں بہ راہ راست اس موضوع سے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر قدیم علماء و فقہاء کے بے نظیر کام

سے بھی ممکنہ حد تک استفادہ کیا گیا ہے، جن حقوق پر راقم کی دوسری کتابوں اور مضامین میں تفصیل سے بحث موجود ہے، اس کتاب میں بہت ہی اختصار کے ساتھ، بلکہ چند جملوں میں ان کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس سب کے باوجود کچھ ایسے حقوق بھی ہیں جن کا ذکر آنے سے رہ گیا ہے، لیکن پوری کتاب کی روشنی میں ان کے سلسلے میں اسلام کے موقف کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

انسانی حقوق کے سلسلے کی جدید معلومات ڈاکٹر، ایس سبرامنیم Dr. S. Subramaniam' کی کتاب Human Rights-International Challenges سے لی گئی ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

کتاب کا انداز خالص قانونی نہیں ہے بلکہ جس حق کا ذکر کیا گیا ہے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی توضیح و تشریح اور حسب موقع معاشرہ پر اس کے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں حقوق کی قانونی حیثیت واضح کرنے کے ساتھ اس سے متعلق اسلام کی اخلاقی تعلیمات بھی بیان ہوئی ہیں۔ اخلاق اور قانون کا رشتہ بہت قوی ہے۔ کسی فرد یا معاشرہ میں اخلاقی حس بیدار ہوجائے تو وہ قانون سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اور آدمی بغیر کسی جبر کے، خوش دلی سے ہر ایک کا حق ادا کرنے لگتا ہے۔ بعض مباحث میں فقہاء کرام کی رائیں اور ان کے اختلافات کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے حقوق کے نئے گوشے واضح ہوتے ہیں اور شریعت میں جو وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے وہ سامنے آتی ہے۔ کوشش اس بات کی رہی ہے کہ موضوع سے متعلق اسلام کی مستند تعلیمات پیش کی جائیں تاکہ کسی بھی موقع پر اعتماد کے ساتھ اس کا حوالہ دیا جاسکے۔ اس حقیر سی کوشش میں چھوٹی بڑی بہت سی خامیوں کا امکان ہے۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ ان سے ضرور مطلع فرمائیں، اللہ جزائے خیر سے نوازے گا، یہ عاجز شکر گزار ہوگا اور آئندہ ان کی اصلاح کردی جائے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازے اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

جلال الدین عمری
۱۳ر نومبر ۲۰۰۴ء

انسانی حقوق کا تصور

(تاریخی پس منظر)

تاریخی پس منظر

اس دنیا میں طاقت ور اور کم زور دونوں طرح کے انسان آج بھی ہیں، کل بھی تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ انسان کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ طاقت ور اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کرے اور کم زوروں کے ساتھ محبت، ہمدردی، تعاون اور دست گیری کا رویہ اختیار کرے۔ جو طاقت ور ہے اس کی طاقت، کم زور کی کم زوری رفع کرنے اور اُسے اوپر اٹھانے میں صرف ہو، طاقت ور اسے اس قابل بنائے کہ زندگی کی دوڑ میں وہ پیچھے نہ رہ جائے، لیکن ماضی کی شہادت اور حال کا مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر حالات میں فطرت کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوا۔ طاقت ور کے ہاتھ میں بے شمار حقوق اور اختیارات جمع ہوتے چلے گئے، کم زور کو ان کا بہت تھوڑا حصہ ملا یا بالکل نہیں ملا، طاقت ور کو طاقت کے نشہ میں اپنی ذمہ داریاں یاد نہیں رہیں اور کم زور، ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا، طاقت ور نے اپنے حقوق و اختیارات کا بے تحاشا استعمال کیا اور کم زور اپنی محرومی پر آنسو بہاتا رہا۔ کبھی تو اُسے مضبوط اور طاقت ور ہاتھوں نے اس طرح دبایا اور کچلا کہ سسکنے، تڑپنے اور فریاد کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ اس طرزِ عمل کا ایک شاخسانہ یہ رہا کہ مختلف ادوار میں اور زمین کے مختلف خطوں میں اصحابِ حقوق اور اصحابِ فرائض کے مستقل طبقات وجود میں آتے چلے گئے۔ ایک طرف وہ گروہ تھا جو گرد و پیش کے تمام وسائل کا مالک و مختار تھا اور دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو ہر چیز سے محروم تھا۔ ایک جانب

آسائش و راحت اور عیش و عشرت کا رقص جاری تھا اور دوسری جانب زندگی اپنے وجود اور بقا کے لیے تڑپ رہی تھی، طاقت ور طبقہ کے ہاتھ میں اقتدار، حکومت، قانون، علم و فن، وسائلِ معیشت اور تہذیب و معاشرت سب کچھ تھا۔ اسی طبقہ سے فرماں روایانِ مملکت، امراء و رؤسائے سلطنت، فوجی جرنیل، علوم و فنون کے ماہر، تہذیب کے معمار اور سماج کے صورت گر پیدا ہوئے اور ہر در و بام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے بالمقابل کم زور طبقہ ان میں سے کسی بھی چیز کا اپنے لیے تصور نہیں کرسکتا تھا۔ وہ زندہ بھی تھا تو صرف اس لیے کہ طاقت ور طبقہ کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ بے روح مشین کی طرح اس کی قوت میں اضافہ کا سبب بنا رہا۔ طاقت ور ایسے بہت سارے حقوق کا مالک بن بیٹھا جن کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں فراہم کی جاسکتی۔ اور کم زور اپنے جائز حقوق سے بھی محروم تھا۔ وہ اس کے لیے جدوجہد کیا معنی اس کا ذکر بھی اپنی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ بعض اوقات اس کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا چلا گیا کہ دونوں طبقات نے اسے قانونِ فطرت سمجھ لیا۔ طاقت ور طبقہ نے سمجھا، یا اسے باور کرا دیا گیا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے ذاتی استحقاق کی بنا پر ہے اور بلا شرکت غیرے وہ اس کا مالک و مختار ہے اور کم زور طبقہ اپنی محرومی پر قانع و صابر ہوتا چلا گیا کہ یہی اس کی قسمت میں ازل سے لکھا گیا ہے۔ کبھی ان کے درمیان کشمکش اور تصادم بھی رہا ہے، بغاوت بھی ہوئی ہے، لیکن صورتِ حال میں بہت زیادہ تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ تصویر جتنی بھیانک ہے اسی قدر بھیانک یہ سوال ہے کہ کیا نوع انسانی کی تاریخ ظلم و ستم ہی کی تاریخ ہے؟ کیا اس نے عدل و انصاف اور فضل و کرم اور جود و احسان کی فصلِ بہار کبھی نہیں دیکھی؟ کیا اس طویل مدت میں اولادِ آدم کی اکثریت اپنے حقوق سے بے خبر اور ناآشنا ہی رہی یا ان سے محرومی ہی اس کے حصہ میں آئی؟ کیا ان حقوق کی حمایت میں کبھی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور ان کے لیے جدوجہد کرنے والے اور حق دار کو حق دِلانے اور اسے ادا کرنے والے پیدا ہی نہیں ہوئے؟

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دنیا نے عدل و انصاف کی مثالیں ضرور دیکھی
ں لیکن زیادہ تر ظلم کی تاریخ ہی رقم ہوتی رہی ہے۔ اصحابِ اقتدار اور طاقت ور طبقات
ں کے سیاہ اوراق میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ زمانہ نہیں گزرا
ہرف چند صدی قبل حقوق انسانی کا تصور شدت سے ابھرا، اس کے لیے جدوجہد شروع
وئی اور اس نے بہت جلد ایک عمومی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اس کا مرکز یورپ خاص
لور پر برطانیہ اور فرانس تھے۔ بعد میں امریکہ نے بھی اس سمت میں پیش رفت کی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کی معلوم تاریخ میں اور مذہبی کتابوں میں انسان کے
بیادی حقوق کے حوالے تو ملتے ہیں لیکن انھیں اس نام سے یاد نہیں کیا جاتا ہے۔ جدید
ور کے مؤرخین کے نزدیک حقوق انسانی کے تصور سے دنیا منشور اعظم (Magna carta)
کے ذریعہ روشناس ہوئی۔ یہ شاہ برطانیہ جون (John) کے دور میں ۱۵؍جون ۱۲۱۵ء کو منظور
ہوا۔ اس منشور سے متعلق یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ برطانیہ کے عوام کو شخصی
ور سیاسی آزادی حاصل ہوگئی۔ یہ درحقیقت بادشاہ سے بعض طبقات کے حقوق پر غور
کرنے کی درخواست تھی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

مغرب میں اس سلسلے کی اور کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں۔

شاہ کانکرڈ ثانی (Concard II) نے ایک منشور کے ذریعے پارلیمنٹ کے
ختیارات متعین کیے۔

۱۱۸۸ء میں شاہ الفانسو نہم (Alfanso IX) سے حبس بے جا کے عدم جواز کا
صول تسلیم کرایا گیا۔

۱۷۶۲ء میں فرانس کے معروف مفکر روسو (Rousseaue) نے معاہدۂ عمرانی
لکھی۔ اسے انقلاب فرانس کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ۱۷۸۹ء میں فرانس
کا منشور حقوق انسانی Declaration of the Rights of Man سامنے آیا۔

۱۷۷۶ء میں امریکی ریاست ورجینا میں منعقدہ اجتماع نے George Mosion

کا مرتب کردہ منشور حقوق انسانی منظور کیا۔

اس سلسلہ کی اور بھی نمایاں کوششیں ہیں۔ اقوام متحدہ نے بھی مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں قرار دادیں منظور کیں۔ آخر میں ۱۰ ردسمبر ۱۹۴۸ء کو اس نے عالمی منشور حقوق انسانی (The Universal Declaration of Human Rights) پاس کیا۔ دنیا کی بیشتر قوموں نے اس کی تائید کی، جن قوموں نے تائید نہیں کی انھوں نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اس پہلو سے اسے اقوام عالم کا متفقہ منشور کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی حکومت اس کا انکار یا مخالفت نہیں کر رہی ہے۔ اسے حقوق انسانی کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم سمجھا جاتا ہے۔

حقوق انسانی کے اس عالمی منشور میں فرد کی آزادی، عدل و انصاف اور مساوات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے ساتھ سیاسی حقوق کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اس میں ہر فرد کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ مساوات ہو، کسی کو اس سے برتر یا اسے کسی سے کم تر نہ سمجھا جائے، اسے جان اور مال کا تحفظ حاصل ہو، اس پر کسی قسم کا جبر وتشدد نہ روا رکھا جائے اور اسے عدل و انصاف ملے۔ اسی طرح عقیدہ اور مذہب، اظہار خیال، تنظیم اور جماعت سازی، سفر اور نقلِ مکانی، اپنی مرضی سے شادی بیاہ اور خاندان بسانے اور عائلی زندگی گزارنے کو اس کا حق مانا گیا ہے۔ تعلیم، حکومت میں شرکت، ملازمت، راحت اور آرام، خلوت اور نجی زندگی میں عدم مداخلت کو بھی اس کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

اس منشور کی یہ خوبی سمجھی جاتی ہے کہ یہ فرد کو اس کے بنیادی حقوق فراہم کرتا ہے اور اس میں حکم راں طبقہ کے جور وستم سے شہریوں کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کی گئی ہے۔ عوام کو طاقت کا سرچشمہ اور حکم رانوں کو ان کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔ عدل و انصاف کے حصول کو آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ فرد کو تعلیم، ترقی اور خوش حالی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں بعض بنیادی خامیاں بھی ہیں۔ ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ان خامیوں کی وجہ سے اس سے متوقع نتائج برآمد نہیں ہو پا رہے ہیں۔

اس منشور کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی ایسی بالاتر قوت نہیں ہے جو کسی قوم کو اس کا پابند بنائے۔ اس پہلو سے بعض اوقات اس کی حیثیت محض پندو نصیحت اور اخلاقی تلقین کی ہوکر رہ جاتی ہے۔ چناں چہ ان ممالک میں بھی جو اسے ایک مقدس صحیفہ سمجھتے اور اس کے گن گاتے رہتے ہیں، حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے واقعات بہ کثرت ہوتے رہتے ہیں۔ ان حقوق کی نگرانی کرنے والے دنیا میں بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں اور مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں ایک European Court of Human Rights ہے۔ اس میں یورپ کے ممالک حقوق انسانی کی پامالی کے مقدمات درج کراتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔

ان مہذب ممالک میں داخلی طور پر حقوق انسانی کی خلاف ورزی جس پیمانہ کی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ بین الاقوامی سطح پر وہ اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ طاقت ور اقوام کو، جنھیں ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے، ان حقوق کا پابند بنانا کم زور قوموں کے بس کی بات نہیں ہے۔ الجیریا، فلسطین، کوسووو، بوسنیا، عراق وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ فلسطین میں جس طرح حقوق انسانی کی پامالی ہو رہی ہے اسے اقوام متحدہ کی جانچ ٹیم کے ذمہ داروں نے تسلیم کیا ہے۔

یہ منشور فرد اور ریاست کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تعین نہیں کرتا۔ اس سے یہ بات واضح نہیں ہے کہ فرد کے حقوق کے حدود کیا ہیں اور کہاں سے ریاست کے اختیارات شروع ہوتے ہیں؟

مذہب کے معاملے میں بھی اس کا رویہ غیر واضح ہے۔ اس میں فرد کو کسی بھی

مذہب کے اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس حقیقت ک
نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مذہب انسان کے حقوق و فرائض کا بھی تعین کرتا ہے۔ سوال ہ
ہے کہ کیا وہ ان پر عمل کرسکتا ہے؟ اگر نہیں کرسکتا یا خاص دائرہ ہی میں کرسکتا ہے تو مذہبی
آزادی کے کیا معنیٰ ہیں؟

یہ منشور اس تصور کے تحت وجود میں آیا ہے کہ انسان آزاد ہے اور وہ اپنے لیے
خود قانون بنا سکتا ہے۔ اسے کسی آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ یا یوں کہا جاسکت
ہے کہ یہ ایک غیر مذہبی یا سیکولر منشور ہے۔ اس میں فطری طور پر سیکولر نظریات کے
ابھرنے، اس نوع کی تحریکوں کے قائم ہونے، فروغ پانے اور اس سے ہم آہنگ کردار کی
تبلیغ و اشاعت کے زیادہ مواقع ہیں۔ عملاً یہی ہو بھی رہا ہے۔ حریتِ فکر اور فرد کی آزادی
کے نام پر ہر معاملہ میں الحاد اور خدا بےزاری، وحی و رسالت اور آخرت کے انکار کا ذہن
کارفرما ہے۔ مخرب اخلاق تحریکیں چلانے، دنیا کو ایک خاص تہذیب اور کلچر کا عادی بلکہ
پابند بنانے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے۔ اسے ترقی اور روشن خیالی سمجھا جاتا ہے۔ اس
کے برعکس کسی دینی تحریک کے چلانے اور دینی اور اخلاقی قدروں کی ترویج و اشاعت
کے مواقع محدود سے محدود تر ہیں۔ اس کی گنجائش نکلے بھی تو اس کی راہ میں طرح طرح
کی رکاوٹیں ہیں، ان کے خلاف ذرائع ابلاغ کے ذریعے فضا بنائی جاتی ہے اور ان کی
بدترین تصویر پیش کی جاتی ہے۔ دقیانوسیت اور بنیاد پرستی کے الزامات لگا کر انھیں
ناقابلِ قبول ٹھہرایا جاتا ہے اور موقع ملنے پر طاقت کے ذریعہ ان کو ختم کرنے کی بدترین
تدبیریں بھی کی جاتی ہیں۔ آزادیِ فکر کے سارے دعوے یہاں ہوا میں تحلیل ہوکر رہ
جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آج حقوق انسانی کا ہر طرف چرچا ہے اور اس سلسلے میں
بعض اچھی اور قابل تعریف مساعی بھی ہو رہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے
انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان حقوق کی خلاف ورزی بھی آئے دن ہوتی رہتی ہے اور اسے

روکنے کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔

اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے۔ وہ دنیا اور آخرت کی فوز و فلاح کا ضامن ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق کا پاسبان اور محافظ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور ان حقوق کی پامالی کو روکنے کی موثر تدابیر اختیار کرتا ہے۔ یہ محض عقیدت و محبت یا جذباتی تعلق کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے جس وسعت اور گہرائی، بصیرت اور ژرف نگاہی سے اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، اس کی نظیر دنیا کے کسی منشور اور کسی دستور میں نہیں پائی جاتی۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ دنیا نے بہت سے معاملات میں جس طرح اسلام سے اکتسابِ فیض کیا ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی اس کی خوشہ چیں ہے، البتہ اس کے اعتراف کی ہمت یا ظرف ابھی اسے حاصل نہیں ہے۔ اسلامی فکر کا پورا تتبع نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ ذہن افراط و تفریط اور بے اعتدالی کا شکار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی نشان دہی کی جائے اور اسلامی فکر میں جو اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے اسے نمایاں کیا جائے۔

اسلام
انسانی حقوق کا پاسبان

بنیادی تصوّرات

- ☜ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے
- ☜ انسان کا وجود اللہ کی مشیت کے تابع ہے
- ☜ کائنات سے استفادہ کا ہر شخص کو حق ہے
- ☜ انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے
- ☜ مذہبی غلامی کا جواز نہیں ہے
- ☜ انسان محترم ہے
- ☜ اللہ تعالیٰ فرماں روائے حقیقی ہے
- ☜ اجتہاد کا حق حاصل ہے
- ☜ اخلاق اور قانون کا تعلق
- ☜ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس

بنیادی تصوّرات

اسلام اس تصور کے خلاف ہے کہ انسان ایک طویل عرصہ تک ظلمت اور تاریکی میں رہا، پھر آہستہ آہستہ اسے علم و فکر کی روشنی ملی۔ اس کے نزدیک انسانِ اول بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے ساتھ اس زمین پر آباد ہوا۔ اس کے بعد ہر دور میں اس کی ہدایت ور رہنمائی کا انتظام ہوتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول اسے حقوق اللہ اور حقوق العباد سے باخبر کرتے رہے۔ انھوں نے ایک طرف یہ بتایا کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا کیا حق عائد ہوتا ہے، دوسری طرف بندوں کے حقوق کی وضاحت کی۔ ان کی تعلیمات میں خدائے واحد کی عبادت سے لے کر حسب حال نظام شریعت بھی رہا ہے۔ اگر انسان نے خدا کا حق ادا نہیں کیا تو اس پر انھوں نے تنقید کی۔ شرک کو مٹایا اور توحید کو قائم کیا۔ انسان نے انسان کے حقوق پر شب خون مارا تو اس کے خلاف بھی انھوں نے آواز اٹھائی، ظلم و ناانصافی کے خاتمہ اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے ان کی مساعی جاری رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اقتدار عطا کیا تو حق دار کو اس کا حق دلایا اور سماج میں عدل و انصاف کو عملاً قائم کیا۔ انسان کی تاریخ کے ساتھ وحی و رسالت کی تاریخ جڑی ہوئی ہے۔ اس سے صرف نظر کر کے اس کا مطالعہ ناقص اور ادھورا ہوگا۔

اسلام نے انسان کو کیا حقوق دئے ہیں اور کس حد تک دئے ہیں اس کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے خود انسان کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہوگا۔ اس

لیے کہ یہ سارے حقوق اسی نقطۂ نظر کے تابع ہیں۔ وہ اس کے فطری اور منطقی نتائج کے طور پر ابھرتے اور اسی کی بنیاد پر تفصیلی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے پہلے اس بات کی کوشش ہوگی کہ انسان کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوجائے، اس کے بعد اس کے حقوق کا ذکر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے

اسلام اس حقیقت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ زمین و آسمان اور یہاں کی ہر چیز اس کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے۔ اس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ انسان اس زمین پر اس کا خلیفہ اور نائب ہے (البقرۃ:۳۰)۔ اس کا کام اس کے احکام کی تعمیل اور ان کا نفاذ ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ اس حقیقت پر ایمان لانے اور اسے تسلیم کرنے سے سماجی زندگی میں زبردست انقلابی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر سے کسی فرد واحد، خاندان یا ادارہ کی مطلق ملکیت اور اجارہ داری ختم ہوجاتی ہے۔ انسان یہ مان کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عطاکردہ ہے۔ اصل مالک وہی ہے۔ وہ اس کے استعمال میں اس کی مرضی اور اس کے احکام کا پابند ہے۔ اس میں آزادانہ تصرف اس کے لیے ناجائز ہے۔ یہاں جو شخص جس حیثیت میں ہے اسی حیثیت میں اس کا امتحان ہو رہا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾ (الانعام:۱۶۵)

وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مقابلے میں بعض کے درجات بلند کیے، تاکہ تم کو ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تمھیں عطا کی ہیں۔ بے شک تمھارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

یہ ایک واضح اعلان ہے کہ اس دنیا میں جس فرد یا گروہ کو اللہ تعالیٰ نے حکومت
قتدار، شرف و منزلت اور مال و دولت سے نوازا ہے یہ اس کے امتحان کے لیے ہے۔
ں کے ذریعہ اسے آزمایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کا کس طرح استعمال کرتا ہے
کم زوروں، محکوموں، محتاجوں اور بے کس لوگوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہے۔ اسی کے
طابق اللہ تعالیٰ کا اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔

یہی بات مختصر الفاظ میں اس آیت میں کہی گئی ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۙ﴿۲﴾ (الملک:۲)

وہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون زیادہ اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔

نسان کا وجود اللہ کی مشیت کے تابع ہے

اس دنیا میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی مشیت کارفرما ہے، یہاں جو انسان بھی پیدا
تا ہے اسی کی مشیت سے پیدا ہوتا ہے، وہ اس کے لیے کم یا زیادہ جتنی حیاتِ مستعار
اہتا ہے عطا کرتا ہے پھر اسی کے فیصلے کے تحت انسان یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے اور
ں کا سفرِ آخرت شروع ہو جاتا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ لِّنُبَیِّنَ لَکُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی

اے لوگو! اگر تم کو بعث بعد الموت کے بارے میں شک ہے (تو دیکھو) کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر لوتھڑے سے پھر مضغۂ گوشت سے جس کا نقشہ مکمل اور نامکمل ہوتا ہے تاکہ اپنی قدرت تم پر واضح کردیں اور ہم تم کو ماؤں کی رحموں میں جب تک چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رکھتے

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ (الحج:۵)

ہیں پھر ہم تم کو حالت طفلی میں نکالتے ہیں پھر جوانی کی عمر تک لے جاتے ہیں تاکہ تم جوانی کے زور اور قوت تک پہنچو۔ تم میں سے کسی پر موت آجاتی ہے اور کوئی ارذل عمر کو لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جاننے کی حالت کو پہنچ جائے۔

یہی حقیقت سورۂ مومن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (المؤمن:۶۷)

وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر وہ تم کو بچہ کی حالت میں نکالتا ہے پھر مہلت دیتا ہے کہ تم اپنی جوانی کے زور کو پہنچ جاؤ۔ پھر تم بوڑھے ہو جاؤ۔ تم میں سے کوئی اس سے پہلے ہی وفات پا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ تم ایک مقررہ وقت تک پہنچو اور شاید تم غور و فکر کرو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موت وحیات کے سلسلے میں اس کی حکمت اور فیصلہ کا ذکر ہے کہ وہ جس شخص کو جتنی زندگی عطا کرنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ کوئی عہد طفلی ہی میں ختم ہو جاتا ہے، کوئی عین دورِ شباب میں اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے اور کوئی بڑھاپے کی منزل تک پہنچ کر موت کی آغوش میں پہنچتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ خدا کی قدرت سے آخرت کا آنا بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جس شخص کو جتنی زندگی ملتی ہے وہ اللہ کی دین ہے۔ جب تک اللہ چاہے اسے زندہ رہنے کا حق ہے۔ کوئی اسے اس حق سے محروم کرتا ہے تو بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

کائنات سے استفادہ کا ہر شخص کو حق ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ وسیع کائنات انسان کے لیے انتہائی موزوں بنائی ہے۔ اس
ں اس کی حیاتِ دنیا کا بہترین ساز وسامان ہے۔ بحر و بر اس کے لیے مسخر کردیے گئے
ں۔ زمین اس کے لیے مستقر ہے۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ اس پر رہ سکے اور
ندگی گزار سکے، وہ یہاں کی ہوا اور پانی سے، سورج کی گرمی اور چاند کی ٹھنڈک سے،
ب و روز کی گردش سے، سمندر کی گہرائی اور دریا کی روانی سے فائدہ اٹھا سکتا اور اسے
پنی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حق دیا ہے کہ وہ
حیثیت انسان بغیر کسی روک ٹوک کے اس کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

(ابراھیم:۳۲-۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے تمھارے لیے پھلوں کا رزق نکالا اور تمھارے لیے کشتیوں کو مسخر کیا تاکہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور تمھارے لیے نہریں مسخر کیں اور تمھارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کیا جو ہمیشہ گردش میں ہیں اور تمھارے لیے رات اور دن کو مسخر کیا اور تمھیں وہ سب چیزیں دیں جو تم نے (تمھاری فطرت نے) طلب کیں۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کرسکتے۔ بے شک انسان بڑا ظالم اور بڑا ناشکرا ہے۔

یہی بات ایک اور جگہ ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الۡاَرۡضِ وَ اَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً‌ ؕ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ۝۲۰ (لقمٰن:۲۰)

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمھارے لیے وہ ساری چیزیں مسخر کردیں (خدمت میں لگادیں) جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردیں۔ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اس دنیا میں بے شم نعمتیں پیدا کی ہیں اور اسی نے ان سے فائدہ اٹھانے کا اسے حق بھی دیا ہے۔ اللہ تعا کی عطا کردہ ان نعمتوں کو کوئی اس سے سلب نہیں کرسکتا۔ اگر سلب کرتا ہے تو بدترین ظلم ارتکاب اور اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے۔

انسان صرف ایک خدا کا بندہ ہے

انسان اللہ واحد کا بندہ ہے۔ اسی کی بندگی اور اطاعت اسے کرنی چاہیے۔ یہاں کسی کا غلام نہیں ہے، لہٰذا اس کا حق ہے کہ وہ ہر غلامی سے آزاد ہو اور فی الوا اسے آزاد ہونا بھی چاہیے۔ کسی فردِ بشر کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کسی فرد کو ا غلام بنائے اور اپنی بندگی پر اسے مجبور کرے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ یہی ک تھا۔ اس نے ان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کے خلاف آواز بلند کی او اس سے کہا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کی عبادت کی دعوت دے رہے ہیں۔ ان ک دعوت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کو جس عذاب میں اس نے ڈال رکھا ہے ا اس سے باز آجائے اور انھیں مصر سے ہجرت کر جانے دے۔ اس کے جواب میں فرعو نے اپنے ان احسانات کا ذکر کیا جو اس نے حضرت موسیٰؑ پر ان کے ابتدائی دور میں کیے تھے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ (الشعراء:۲۲)

اور یہ احسان جو تو مجھ پر جتا رہا ہے وہ اس وجہ سے تھا کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔

اگر فرعون نے حضرت موسیٰ پر کوئی احسان کیا بھی تھا تو کسی فردِ واحد کے ساتھ م دردی اور انسانیت کا برتاؤ اس امر کا جواز نہیں فراہم کرتا کہ اس کی پوری قوم کو جبر کے نکنجہ میں کس لیا جائے اور غلامی کی زندگی پر اسے مجبور کیا جائے۔ اس کی آزادی کا حق پنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جس احسان کا تو ذکر کر رہا ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اس غلام قوم کی نسل کشی کی جو تدبیر تو کر رہا تھا، اس سے میں محفوظ رہا اور تو سمجھ نہ سکا کہ میں بھی اسی قوم کی اولاد ہوں۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور بنی اسرائیل کی آزادی کے مطالبہ کو فرعون نے نقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ اس نے کہا موسیٰ (اور ان کے بھائی ہارون) کا تعلق تو ہماری لام قوم سے ہے۔ انھیں ہم کیسے اللہ تعالیٰ کا رسول اور اپنا راہ نما مان سکتے ہیں؟ فرعون ور اس کی قوم کا نسلی غرور اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول کرنے کی راہ میں مانع ہوا اور وہ غرقِ دریائے نیل کر دیے گئے۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ (المؤمنون:۴۷،۴۸)

انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں (حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ) پر ایمان لے آئیں جب کہ ان کی قوم ہماری ماتحت اور تابع دار ہے۔ پس ان لوگوں نے ان دونوں کی تکذیب کی اور ان قوموں میں شامل ہو گئے جو ہلاک کر دی گئیں۔

یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون کسی فرعونِ وقت کو برداشت نہیں کرتا۔ حکومت و اقتدار اس لیے نہیں ہے کہ ایک طبقہ دوسرے کو محکوم اور غلام بنائے رکھے۔ ریاست میں کسی کا حق دوسرے سے کم نہیں ہے۔ سب کے حقوق یکساں ہیں۔ حکومت ان حقوق کی پاسبان ہے نہ کہ غارت گر۔

مذہبی غلامی کا جواز نہیں ہے

سیاسی غلامی کے ساتھ مذہبی غلامی کا بھی اسلام مخالف ہے۔ اس نے پاپائیت اور برہمنیت جیسے مذہبی اداروں کو ختم کیا اور یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی ہدایت کے تحت انسان براہِ راست اس سے تعلق قائم کرسکتا، اسے یاد کرسکتا، اس کی عبادت کرسکتا، اس کے لیے نذر و نیاز اور قربانی پیش کرسکتا ہے۔ مشکلات میں انسان اس کی طرف رجوع کرے اور اس کے سامنے دستِ دعا پھیلائے تو وہ اس کی دعا سنتا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ (البقرة:۱۸۶)

جب تم سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو بتا دو کہ میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والا جب دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ پس ان کو بھی میرا حکم ماننا چاہیے اور مجھ پر ایمان لانا چاہیے۔ اس سے امید ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے کسی دیوی، دیوتا، یا کسی پوپ، پنڈت اور پروہت کے واسطہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ؕ وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۬ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾ (الزمر:۳)

سن لو! اللہ ہی کے لیے ہے دینِ خالص، جن لوگوں نے اسے چھوڑ کر حمایتی بنا رکھے ہیں ان کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں خدا سے قریب کردیں۔ بے شک اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور حق کو نہ ماننے والا ہو۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسان کو سیاسی اور مذہبی کسی بھی حیثیت سے

محکوم بنانا قطعاً ناجائز ہے، اس کا حق ہے کہ اسے آزادی کی نعمت ملے اور وہ کسی فرد یا دارے کا غلام نہ رہے۔

انسان محترم ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی دوسری بے شمار مخلوقات پر شرف وفضیلت عطا کی ہے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿٧٠﴾ (الاسراء:۷۰)

ہم نے بنو آدم کو عزت دی اور خشکی اور تری کے لیے ان کو سواری دی اور ان کے کھانے کے لیے پاک چیزیں عطا کیں اور اپنی مخلوقات میں سے بیشتر پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان کو دوسری مخلوقات پر جو شرف و فضیلت حاصل ہے، اس کے بعض پہلوؤں کا خود قرآن مجید نے صراحتاً ذکر کیا ہے اور بعض کی طرف اشارات کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین خلقت عطا کی ہے۔ وہ اپنی جسمانی ساخت، شکل وصورت، قد و قامت، اعضاء و جوارح کے تناسب اور ظاہری ہیئت کے لحاظ سے دنیا کی حسین ترین مخلوق ہے۔ سورۂ تین میں ارشاد ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿٤﴾ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت طریقہ سے پیدا کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (التغابن:۴)

اس نے تمھاری صورت گری کی اور تمھیں بہت اچھی شکل وصورت عطا کی۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ

وہ اللہ جس نے تجھے پیدا کیا۔ تیرے اعضاء و جوارح کو ٹھیک کیا۔ ان میں

رَكَّبَكَ ۝	توازن اور اعتدال رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔ (الانفطار:۷،۸)

وہ حیوان ناطق ہے، اسے قوتِ گویائی عطا کی گئی ہے، وہ بولنے کی صلاحیت رکھتا اور اپنی زبان کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کرسکتا ہے۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (الرحمٰن:۳،۴)	اس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے گویائی سکھائی۔

قلم کے ذریعہ بھی وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔

الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ (العلق:۴)	جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔

یہ امتیاز کسی جانور کو حاصل نہیں ہے کہ وہ زبان وقلم کا مالک ہو اور ان کے ذریعہ اپنے خیالات دوسروں تک منتقل کرسکے۔ یہ چیز انسان سے چھن جائے تو وہ جانور کی سطح پر آجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اچھے جسم کے ساتھ دل و دماغ بھی عطا کیا ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْأَبْصَارَ وَ الْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ (السجدة:۹)	اس نے تمھیں کان، آنکھ اور دل عطا کیے لیکن تم بہت کم اس کا شکر ادا کرتے ہو۔
وَ اللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ أُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَ الْأَفْئِدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (النحل:۷۸)	اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا کہ تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے۔ (پھر) اس نے تمھیں کان، آنکھیں اور دل عطا کیے۔ (جن کے ذریعے تم بہت سی چیزوں کو جاننے لگے) تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔

وہ سوچنے، سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ واقعات سے نتائج اخذ کرتا اور نت نئے تجربات کرتا ہے۔ جدید سے جدید تر صنعت وحرفت اس کی مرہون منت ہے۔ حیرت انگیز ایجادات و اختراعات اس کے ذریعہ جنم لیتے ہیں اور وہ اپنے لیے نئے

نئے وسائلِ حیات تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس طرح مادی ترقی اور خوش حالی کی طرف اس
ل پیش رفت جاری رہتی ہے۔

عقل کے ذریعہ انسان برے بھلے کے درمیان فرق کرتا ہے، اعمال کے حسن و قبح
ر درست و نادرست کا فیصلہ کرتا ہے، معاملات میں اپنی رائے قائم کرتا اور اپنی مرضی
سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ یہی خوبی انسان کو ایک ذمہ دار فرد بناتی ہے۔

یہ انسان کی عزت و تکریم کے بعض پہلو ہیں۔ ان کی خلاف ورزی اس عزت و
تکریم کے منافی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے، اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنا
راسر ظلم ہوگا جس کی وجہ سے اس کا مقام انسان کی سطح سے گر کر جانور کی سطح تک پہنچ
جائے۔ اسلام ہر اس چیز کا مخالف ہے جو احترام آدمیت سے متصادم ہے۔ فقر و فاقہ، غذا
کی کمی یا ناپاک اور گندی غذاؤں کے استعمال پر اس کا مجبور ہونا، غیر معمولی اور ناقابلِ برداشت
محنت و مشقت کا بوجھ اس پر ڈالنا، اس کے لیے طبی سہولیات کا نہ ہونا، یا ایسی سزائیں دینا
جس سے اس کا جسم اپنی فطری ساخت کھو بیٹھے، یہ سب اس کے خلقی حسن کو بگاڑنے
کے ہم معنی ہے۔ اسلام اس غیر انسانی روش کی کسی حالت میں اجازت نہیں دیتا۔[1]

اسی طرح انسان کو علم کی روشنی سے محروم رکھنا، ایسا رویہ اختیار کرنا جس سے اس
کی فکر کو بالیدگی نہ مل سکے اور اس کی دماغی اور فکری صلاحیتیں منجمد ہو کر رہ جائیں اور اس کی
زبان اور قلم پر ناروا پابندی لگانا، یہ سب انسان کی تکریم کے صریح منافی ہے۔ اسلام ان
سب کی بہ حسن و خوبی تکمیل چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماں روائے حقیقی ہے

انسان اجتماعیت پسند ہے۔ سب سے کٹ کر الگ تھلگ زندگی گزارنا اس کی

---

[1] قرآن مجید کا یہ بیان کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کھانے کے لیے پاک چیزیں عطا کی ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' عنوان 'انسان کو پاک غذائیں دی گئی ہیں'۔ طبع جدید، ص ۹۴-۹۶

فطرت کے خلاف ہے۔ وہ سماج کا ایک حصہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ سماج اس کی بنیادی ضرورت بھی ہے، اس کی ضروریاتِ زندگی اسے سماجی زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہیں۔ وہ دوسروں کے تعاون ہی سے اپنی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔ سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ کچھ حقوق رکھتا ہے اور اس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اس کے ان حقوق کو ادا کرنا ہر مہذب سماج کے لیے لازم ہے اور جو ذمہ داریاں سماج کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انھیں پوری کرے۔ یہ حقوق اور ذمہ داریاں فرد پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ خاندان، سماج اور قبیلہ کا بھی اس میں حصہ ہے اور ریاست کو بھی اس میں اپنا کردار ادا کرنا لازمی ہے۔

ان حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کون کرے گا؟ کیا فرد خود سے اس کا تعین کرے گا یا کسی دوسرے فرد کو اس کا حق حاصل ہوگا یا معاشرہ کی روایات سے اس کا تعین ہوگا یا ریاست اس کا فیصلہ کرے گی یا ان میں سے ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے اور سب مل کر اس کا فیصلہ کریں گے؟ اسلام اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اس کے تعین کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ وہی قانون ساز ہے، قانون دینے کا حق اسی کو حاصل ہے، وہی ہر ایک کا حق بھی متعین کرتا ہے اور ذمہ داریاں بھی واضح کرتا ہے۔ فرد، سماج اور ریاست سب اس کے پابند ہیں۔ قانون سازی کا حق اس نے نہ کسی فرد کو دیا ہے، نہ کسی مذہبی شخصیت اور ادارہ کو اور نہ معاشرہ اور ریاست کو۔ بعض اوقات انسانی قانون کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اسے غلط اور باطل قرار دیا ہے۔

اہل عرب نے خود سے چیزوں کو حلال یا حرام قرار دے کر اسے خدا کے قانون کی حیثیت دے رکھی تھی۔ اس پر قرآن نے سخت تنقید کی اور کہا کہ یہ صرف اللہ کا اختیار ہے کہ وہ کسی چیز کی حرمت یا حلّت کا فیصلہ کرے۔ کسی کا خود سے یہ کام کرنا اور اسے اللہ کی طرف منسوب کرنا اس کی جناب میں تہمت اور افترا پردازی ہے۔ اس کے مرتکب، دنیا اور آخرت میں فلاح نہیں پائیں گے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ	تمھاری زبانیں جو جھوٹ بولتی ہیں اس کی
الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ	بنا پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال اور یہ حرام ہے۔
لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ	اس طرح تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے
الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ	جو لوگ اللہ پر جھوٹی افترا پردازی کرتے
لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۶﴾ (النحل:۱۱۶)	ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء فقہاء اور مشائخ کو مطلق قانون سازی کا حق دے رکھا تھا۔ وہ جواز و عدم جواز کے آزادانہ فیصلہ کرتے۔ وہ جس چیز کو جائز کہتے وہ جائز ہوجاتی اور جس چیز کے ناجائز ہونے کا فرمان صادر کرتے وہ ناجائز ہوجاتی۔ قرآن نے اس پر سخت گرفت کی اور کہا کہ کسی عالم، فقیہ یا فقیر اور درویش کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ شارع اور قانون ساز بن بیٹھے۔ یہ کام صرف اللہ کا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو شریعت اور قانون عطا کرے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار اور
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ	رہبان کو رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی
ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا	حالاں کہ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اللہ واحد
لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ	کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود
اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾	نہیں۔ پاک ہے اس کی ذات شرک سے
(التوبۃ:۳۱)	جس کا وہ ارتکاب کر رہے ہیں۔

اہل کتاب کو توریت عطا کی گئی اور یہ ہدایت کی گئی کہ اس کی روشنی میں زندگی گزاریں اور اپنے معاملات کے فیصلے کریں۔ اس کے ابتدائی حاملین کا اس پر عمل تھا۔ انھوں نے اس کی پوری پابندی کی اور دنیا کے سامنے اس کے گواہ اور شاہد بن کر رہے۔ لیکن جب بگاڑ آیا تو اللہ کی کتاب پیچھے چلی گئی اور اس سے آزاد فتووں اور فیصلوں نے کتاب اللہ کی حیثیت اختیار کرلی۔ اسی سے ان کے کفر و ضلالت اور تباہی کا آغاز ہوا۔

إِنَّآ أَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى وَّ نُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِيْنَ أَسْلَمُوا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(المائدۃ: ۴۴)

ہم نے توریت نازل کی، اس میں ہدایت اور نور ہے۔ اسی کے مطابق انبیاء جو اللہ کے فرماں بردار تھے اور ان کے درویش اور عالم یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان سے اللہ کی کتاب کی حفاظت کا مطالبہ کیا گیا تھا اور وہ اس کی گواہی دینے والے بنائے گئے تھے۔ پس تم لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کے ذریعہ ثمنِ قلیل نہ خریدو۔ جو لوگ ان احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے جو اللہ نے نازل کیے ہیں وہی کافر ہیں۔

اس چیز نے کسی بھی فرد یا ادارہ کی مطلق بالادستی اور بے قید فرماں روائی کے تصور کو ختم کر دیا۔ اس نے کسی کو یہ حق ہی نہیں دیا کہ وہ دوسروں کے حقوق کا تعین کرے اور ان کی ذمہ داریاں بتائے۔ انسان خود بھی اپنے حقوق اور ذمہ داری کے تعین کا مجاز نہیں ہے۔ اس معاملہ میں ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اجتہاد کا حق حاصل ہے

یہاں اس قانون سازی کا ذکر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود میں رہ کر ہوتی ہے۔ اس کی اجازت خود اس نے دی ہے۔ اسی کو تفقہ اور اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ کسی زندہ اور ابدی شریعت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر وہ تغیر پذیر زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ وہ امن وخوف کی خبریں بلا تحقیق اس طرح پھیلاتے ہیں کہ ملک کا امن و امان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس معاملے میں صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾ (النساء:۸۳)

جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اگر اسے وہ لوٹا دیتے رسول کی طرف اور اولوالامر کی طرف جو ان میں اس کی تحقیق کر سکتے ہیں تو وہ حقیقت حال سے باخبر ہوتے۔ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے چل پڑتے سوائے چند ایک کے۔

اس میں واضح ہدایت ہے کہ ریاست کے نازک معاملات میں ظن وتخمین سے کام لینے اور افواہیں پھیلانے کی جگہ اللہ کے رسول اور اولی الامر، جو معاملات کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں، کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ کی طرف اور ریاست کے ذمہ دار افراد کی طرف رجوع کرنے کا حکم تھا۔ آپ کے بعد آپ کی ہدایات اور 'اولو الامر' کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ صحیح صورتِ حال سے امت کو باخبر کریں، اولو الامر میں امراء و حکام کے ساتھ علماء وفقہاء بھی آتے ہیں۔ اس لیے کہ دینی مسائل کا استنباط وہی کر سکتے ہیں اور حکام کی طرح ان کی ہدایات بھی نافذ العمل ہوں گی۔[1]

یہ نازک حالات میں استنباط و اجتہادِ مسائل کا صریح حکم ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔[2]

اخلاق اور قانون کا تعلق

انسان کے اندر اخلاقی حس موجود ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے محبت اور پست اخلاق

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جصاص، احکام القرآن: ۲/۲۶۹-۲۷۲

[2] اجتہاد اور استنباط کی نازک حدود وشرائط ہیں۔ ان سے یہاں بحث نہیں ہے۔ انھیں جاننے کے لیے اس فن کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

سے نفرت اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی وجہ سے چاہے ہزار اخلاقی خرابیاں اس کے اندر موجود ہوں وہ مکارم اخلاق کو پسند اور رذائل اخلاق کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کی یہ اخلاقی حس بیدار اور طاقت ور ہو جائے تو وہ تہذیب و شرافت کا نمونہ بن جائے اور کسی کو کسی سے شکایت نہ ہو۔ اسلام انسان کے اس جذبہ کو زندگی و توانائی عطا کرتا ہے۔ اس نے انسان کے حقوق کی سادہ سی فہرست نہیں فراہم کردی ہے بلکہ اخلاق سے ان کا رشتہ جوڑ دیا ہے۔ بہت سے قانونی حقوق کو وہ انسان کی اخلاقی خوبیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان کی پابندی کی ترغیب دیتا ہے، ان کا اجر و ثواب بیان کرتا اور ان کی خلاف ورزی پر سخت وعید سناتا ہے۔ اس نے ان حقوق کے سلسلہ میں فرد کے ضمیر کو بیدار کیا اور سماج کے اندر اس کے حق میں فضا بنائی ہے۔ قتل نفس، قتلِ اولاد، سرقہ، بدکاری، دشنام طرازی، افترا و تہمت، حق تلفی اور ظلم و زیادتی جیسی خرابیوں کو وہ فسق و فجور اور کبائر میں شمار کرتا ہے اور اس پر سخت وعید سناتا ہے۔ ان کے بالمقابل جن پہلوؤں سے بھی آدمیت کا احترام ہو ان کی وہ تحسین کرتا اور ان کے اجر وثواب کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح حقوق انسانی کی اس کے نزدیک مجرد قانونی حیثیت ہی نہیں ہے بلکہ انسان کے اعلیٰ اخلاقی کردار کی بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس

اسلام نے ایک طرف تو انسانی حقوق کو قانونی اور اخلاقی تحفظ فراہم کیا اور دوسری طرف اس کے احترام کا جذبہ بیدار کیا۔ اس کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا قانون ہے اور اس کے بتائے ہوئے احکام ہیں۔ اس کے قائم کردہ حدود سے ان کا تعلق ہے۔ ان کی پابندی ہر حال میں لازمی ہے۔ اس سے انسان کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا مستحق ٹھہرے گا اور ان کی خلاف ورزی پر اللہ کے سامنے اسے جواب دہ ہونا پڑے گا اور وہ وہاں کے ہولناک عذاب سے دو چار ہوگا۔ اللہ کے نیک بندوں کی ایک خوبی وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (التوبۃ:۱۱۲) ہے۔ یعنی وہ اللہ کے قائم کردہ

حدود کی نگہداشت کرتے ہیں کہ ان سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ اسے بعض مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

وراثت میں قرابت داروں کے حقوق بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

(النساء: ۱۳، ۱۴)

یہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کے حدود سے تجاوز کرے تو اسے وہ نار جہنم میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہوگا۔

قرآن مجید نے ان حقوق کی پابندی کو قیامت کے عقیدہ سے جوڑ دیا ہے۔ یہ عقیدہ ان حقوق کی پامالی سے انسان کو باز رکھتا اور اسے ان کے احترام پر مجبور کرتا ہے۔ قتلِ ناحق قانونی جرم ہی نہیں گناہِ کبیرہ ہے۔ ایک جگہ کہا کہ اہل ایمان شرک، قتلِ نفس اور عصمت دری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس کے بعد فرمایا:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۰﴾

(الفرقان: ۶۸-۷۰)

جو ان کا ارتکاب کرے وہ گناہ (کی سزا) پائے گا، قیامت کے روز اسے دوگنا عذاب دیا جائے گا اور اس میں ذلیل و خوار ہوکر ہمیشہ پڑا رہے گا۔ ہاں! جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل صالح کیا تو ایسے لوگوں کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

دورِ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا۔ اس گھناؤنے جرم پر قرآن

نے ان الفاظ میں تنقید کی۔

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹ (التکویر:۸،۹)

جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں وہ ماری گئی۔

یتیم کے مال پر ناجائز قبضہ کی ممانعت کے بعد ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۝۱۰ (النساء:۱۰)

جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور جلد ہی جہنم میں داخل ہوں گے۔

ایک جگہ امانتوں کی ادائیگی کا حکم ہے۔ اس میں مالی امانتیں بھی شامل ہیں اور عہدہ و منصب کی امانتیں بھی۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۝۵۸

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اصحاب امانت تک پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقیناً اللہ تمھیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ (النساء:۵۸)

قیامت کے حساب کتاب اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ابھر آئے تو انسانی حقوق کی خلاف ورزی شاید نہ ہو۔ اس احساس کا فقدان ہی ادائے حقوق کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔

فرد کے شخصی اور ذاتی حقوق

- زندہ رہنے کا حق
- حق مساوات
- عدل و انصاف کا قیام
- قانون کی برتری
- ریاست حقوق کی نگراں ہے
- جرم عدالت سے ثابت ہوگا
- کسی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا
- کسی کو ناحق سزا نہیں دی جاسکتی
- عزت و آبرو کا حق
- سفر کا حق
- مظلوم کا حق

شخصی اور ذاتی حقوق

زندہ رہنے کا حق

فرد کے حقوق میں سب سے بڑا اور بنیادی حق اس کے زندہ رہنے کا حق ہے۔ اسی پر دوسرے حقوق کا انحصار ہے۔ یہ حق کسی سے سلب کرلیا جائے تو دوسرے حقوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دنیا کے تمام جمہوری قوانین نے اسے ایک فطری اور بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ یہ حق مطلق اور غیر مشروط نہیں ہے۔ عدل و انصاف اور جائز قانون کے تحت کسی کو اس حق سے محروم بھی کیا جاسکتا ہے۔

اسلام نے انسان کو زندگی کا حق عطا کیا، اس پر دست درازی سے شدت سے منع کیا اور اسے پورا تحفظ فراہم کیا اور اعلان کیا کہ جب تک حق و انصاف کا مطالبہ نہ ہو اسے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے نزدیک ہر انسان جو یہاں پیدا ہوتا ہے زندہ رہنے کا حق لے کر پیدا ہوتا ہے۔ زندگی اسے اللہ کی طرف سے ملی ہے۔ وہی اس کا مالک ہے، اسے کوئی سلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنی زندگی ختم نہیں کرسکتا۔ اسی وجہ سے خودکشی حرام ہے۔

اسلام نے اہل ایمان کا ایک نمایاں وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ ناحق کسی کی جان نہیں لیتے۔

وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الفرقان:٦٨)	وہ کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، قتل نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کہ حق کا تقاضا ہو۔

صحیح بخاری کی حدیث ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الکبائر: الاشراک باللہ و عقوق الوالدین و قتل النفس والیمین الغموس[1]	کبائر ہیں اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی نفس کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل نفس جیسے جرم کبیر سے اہل ایمان کا دامن پاک ہوتا ہے اور پاک ہونا چاہیے۔

اسلام نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ انسان کب زندگی کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ کون سے جرائم ہیں جن کے ارتکاب کے بعد وہ اپنے حقِ حیات کا مطالبہ نہیں کرسکتا اور معاشرے کے لیے وہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (المائدة:٣٢)	جو کوئی کسی نفس کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو، تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا۔ جس نے کسی نفس کو زندہ رکھا گویا اس نے سب انسانوں کو زندہ کیا۔

یہ حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا اور یہی اسلامی شریعت میں بھی باقی رکھا گیا ہے کہ اگر آدمی کسی کا ناحق خون بہائے یا مملکت میں فساد پھیلائے اور کشت وخون کا بازار گرم کرے تو اپنی جان کی حرمت ختم کر دیتا ہے۔ اس کا وجود روئے زمین پر ناقابلِ برداشت ہے۔ اسے راستے سے ہٹا کر امن و امان بحال کرنا ریاست کا فرض ہے۔ اسے کسی پہلو

[1] بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب الیمین الغموس

سے غلط نہیں کہا جا سکتا[1]

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ کسی فرد واحد کا بھی ناحق خون بہانا ایک سنگین جرم ہے یہ ساری نوع انسانی کو خوں ریزی کی راہ پر لگانا ہے۔ اس کے برخلاف کسی مظلوم اور بے گناہ کی جان بچانا پورے عالم کے لیے حیات بخش ہے، اس لیے کہ اس سے انسانی جان کی قدر و قیمت کا سبق ملتا ہے۔ آدمؑ کی اولاد میں جس نے پہلی بار اپنے بھائی کا ناحق خون بہایا، اس نے دوسروں کو یہ راہ دکھائی، اسی لیے جب کبھی زمین پر خون ناحق بہے گا، اسے اس میں شریک سمجھا جائے گا اور اس کے نامۂ اعمال میں اس کا گناہ لکھا جائے گا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن اٰدم الاول کفل من دمها لأنه اول من سن القتل[2]	کوئی شخص ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے تو اس پہلے ابن آدم پر بھی اس خون کا ایک حصہ ہوگا جس نے قتل کیا تھا کیوں کہ اس نے ناجائز قتل کا طریقہ دنیا کو دکھایا تھا۔

قتل ناحق کے سلسلہ میں اسلام نے حسب ذیل ہدایات دی ہیں:

۱- قاتل سے قصاص لیا جائے یعنی کسی نے ناحق قتل کیا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کسی دوسرے کو اس جرم کے ارتکاب کی ہمت نہ ہوگی۔ اسی لیے فرمایا گیا:

---

[1] حدیث میں آتا ہے کہ تین جرائم ایسے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا قتل ہوگی۔ ایک ارتداد، دوسرا کسی بے گناہ کو قتل کرنا، تیسرا کسی شادی شدہ شخص کا بدکاری میں ملوث ہونا۔ عن عبد الله بن مسعودؓ قال قال رسول الله ﷺ لایحل دم امریٔ مسلم یشهد ان لا اله الا الله وأنی رسول الله الا باحدی ثلٰث النفس بالنفس والثیب الزانی والمارق لدینه التارک للجماعة۔ بخاری، کتاب الدیات، باب قوله تعالیٰ النفس بالنفس۔ مسلم، کتاب القسامة، باب مایباح به دم مسلم۔

[2] بخاری کتاب الانبیاء، باب خلق آدمؑ و ذریته۔ مسلم، کتاب القسامة، باب بیان اثم من سن القتل

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (البقرة:۱۷۹)

تمھارے لیے اے عقل والو قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے اس طرح تم اس کے ارتکاب سے بچوگے۔

قصاص میں مقتول کے ساتھ قاتل کی بھی جان جاتی ہے۔ بہ ظاہر اس میں مزید ایک فرد کا نقصان ہے لیکن اس میں پوری قوم کی حیات ہے۔ قانون قصاص پر صحیح معنی میں عمل ہو تو اقدام قتل سے پہلے آدمی ہزار بار سوچے گا کہ اس کے بعد اسے بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس سے قتل ناحق کی راہ مسدود ہوگی اس میں صرف دو افراد ہی کی زندگی نہیں ہے بلکہ پوری نوعِ انسانی کی حیات ہے۔

۲- اگر مقتول کے ورثاء چاہیں تو قصاص کی جگہ دیت لے سکتے ہیں اور انھیں پوری دیت لینے اور اس میں کمی کرنے کا اختیار ہوگا۔ وہ قاتل کو معاف بھی کرسکتے ہیں۔ معافی پسندیدہ عمل ہے۔ اس کی ترغیب دی گئی ہے۔[۱]

۳- ان تمام معاملات کا اختیار مقتول کے اہل خاندان کو حاصل ہوگا۔ اسلام نے اسے ریاست کے دائرۂ اختیار سے باہر رکھا ہے۔ ریاست اس میں مقتول کے ورثاء کو ان کا حق دلانے میں مدد دے گی اگر وہ قاتل کے ساتھ کوئی غیر شرعی اور غیر انسانی رویہ اختیار کرنا چاہیں یا اس کے ساتھ خاندان کے دوسرے افراد کو انتقام کا نشانہ بنانے کی کوشش کریں یا اور کسی قسم کی ظلم و زیادتی پر آمادہ ہوں تو اس کی انھیں اجازت نہ ہوگی۔ قانوناً انھیں اس سے باز رکھا جائے گا۔

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾ (الفرقان:۶۸)

جس نفس کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اسے قتل نہ کرو سوائے اس کے کہ حق کا تقاضا ہو۔ اور جو کوئی ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو حق اور اختیار دیا ہے۔ لیکن وہ قتل میں حد سے آگے نہ بڑھے۔ بے شک اس کی مدد ہوگی۔

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (بقرہ:۱۷۸)

حقِ مساوات

مساوات کو انسان کا بنیادی حق ہی نہیں بلکہ تمام حقوق کی اساس کہا جاتا ہے۔ حقوق انسانی کے عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) میں جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حقوق سب کو یکساں حاصل ہوں گے۔ اس میں نسل، رنگ، جنس (مرد اور عورت) زبان، مذہب، سیاسی یا دیگر افکار و خیالات، سماجی و معاشی حیثیت اور جائے پیدائش کی بنیاد پر فرق و امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ یہی بات بین الاقوامی سماجی و سیاسی معاہدہ (International Covenant on Civil and Political Rights) میں کہی گئی ہے۔

ریاست کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ان حقوق کو پامال نہ ہونے دے اور اس کے تقاضوں کو زندگی کے کسی بھی معاملہ میں متاثر ہونے سے بچائے۔[۱]

دنیا نے مساوات کے تصور کو آج جتنی اہمیت دی ہے اسلام نے اسے اس سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ وحدت انسانیت اور مساوات کا تصور اس کی اساسی تعلیمات میں شامل ہے۔ اس نے اس وقت اسے اجاگر کیا جب کہ دنیا اس سے بے خبر اور نا آشنا تھی۔

انسانوں کے درمیان رنگ، نسل، زبان، خطۂ ارض، جنس، عہدہ اور منصب اور صنعت و حرفت وغیرہ کا فرق فطری طور پر پایا جاتا ہے، لیکن اس فرق کو انسان نے اپنی نادانی سے یہی نہیں کہ حقیقی فرق سمجھ لیا بلکہ اسے بلندی و پستی کا معیار بھی قرار دے دیا، کبھی اس نے سفید فام کو سیاہ فام سے اونچا قرار دیا، کبھی کسی خاص نسل کی دوسری نسلوں سے برتری کا تصور اس پر چھایا رہا، کبھی کسی زبان کے بولنے والوں کو دوسری زبان والوں سے برتر سمجھ بیٹھا، کبھی نوعی اور صنفی فرق اس کے نزدیک وجہِ تفوق بن گیا اور عورت پر مرد کی برتری ناقابلِ نزاع بنی رہی، آج بھی مساوات کے ہزار دعووں کے باوجود یہ فرق باقی ہے۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز کے اس تصور پر کاری ضرب لگائی

---

[۱] ملاحظہ ہو: Human Rights International Challenges Volume 1 p.p.79-84

اور اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ انسانوں کے درمیان فرق و اختلاف دراصل باہم تعارف کا ذریعہ ہے، حقیقی فرق نہیں ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ معلوم ہو کس فرد کا کس سرزمین اور کس ملک سے تعلق ہے؟ وہ کون سی زبان بولتا ہے اور اس کی جنس کیا ہے؟ یہ تعارف اصلاً ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ اگر سب کے رنگ روپ، شکل صورت، قد وقامت، زبان اور بولی ایک ہوتی تو انھیں پہچانا نہ جاتا، انسانوں کے درمیان یہ تنوع قدرت کی نشانی ہے کہ اس نے اس تنوع اور رنگا رنگی کے اندر نوعِ انسانی کی وحدت باقی رکھی ہے۔ یہ کثرت میں وحدت کی دلیل ہے۔ اختلاف و انتشار کی دلیل نہیں ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾ (الحجرات:۱۳)

اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک تم میں سب سے بزرگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے۔ یقیناً اللہ علیم و خبیر ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فتحِ مکہ کے بعد جو خطبہ دیا، اس میں قومی اور نسلی برتری کے احساسات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور بتایا کہ آدم کی اولاد سب ایک حیثیت کی مالک ہے، ہاں تقویٰ، خدا ترسی اور رفعتِ کردار سے انسان عزت و سربلندی کے مقامِ رفیع تک پہنچتا ہے اور وہ دوسروں کے لیے قابلِ احترام ٹھہرتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

یایها الناس الا ان ربکم واحد و ان أباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لأحمر علی اسود ولا لأسود علی احمر الا بالتقوی[۱]

اے لوگو! سن لو بے شک تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ (بھی) ایک ہے۔ سن لو کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سفید پر کوئی فضیلت نہیں ہے سوائے تقویٰ کے (جس کے اندر جتنا تقویٰ ہوگا اتنا ہی وہ صاحب فضیلت ہوگا)

---

[۱] مسند احمد: ۵/۴۱۱

یہ انسان کی مساوات کا واضح ڈیکلریشن تھا کہ کسی بھی فرد کو چاہے اس کا تعلق کسی بھی نسل و قوم سے ہو، کسی دوسری رنگ و نسل اور قوم کے فرد پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ برتری کا معیار صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہے، جو جتنا خدا ترس ہے وہ اتنا ہی عزت و احترام کا مستحق ہے۔[1]

انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز اور ان پر ظلم و زیادتی خدا کی آتشِ غضب کو بھڑکاتی ہے اور جس قوم کو یہ مرض لگ جائے وہ بالآخر تباہ ہوجاتی ہے۔ فرعون اور اس کی قوم نسلی تعصب اور احساس برتری میں مبتلا تھی اور وہ بنی اسرائیل کو اپنے مساوی حیثیت دینے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے انھیں غلام بنائے رکھا تھا اور انھیں محض خدمت گار کی حیثیت سے دیکھتی تھی، نسل کشی کے ذریعہ ان کی افرادی قوت گھٹانے اور انھیں کم زور کرنے کی مسلسل تدبیریں کر رہی تھی اور ان کے ابھرنے کے تمام مواقع اس نے مسدود کر رکھے تھے، کسی قوم کے ایک طبقہ کو اس طرح دبانا اور کچلنا سنگین جرم تھا۔ قرآن مجید نے اس ظلم کو جگہ جگہ نمایاں کیا اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی اس روش کے مقابلہ میں بنو اسرائیل جیسی کم زور قوم کو اوپر اٹھایا اور فرعون اور اس کی قوم اپنے انجامِ بد کو پہنچ کر رہی۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي	بے شک فرعون نے ارضِ مصر میں سرکشی کی راہ اختیار کی اور وہاں کے باشندوں کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک فرقہ (بنی اسرائیل) کو کم زور بنائے رکھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا۔ بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ ہم ان لوگوں پر احسان کرنا چاہتے تھے جو زمین میں کم زور بنا کر رکھے گئے تھے، ان کو امام اور وارث بنانا چاہتے

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا رسالہ 'اسلام اور وحدتِ بنی آدم'

الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (القصص:۴-۶)

تھے اور ان کو زمین میں اقتدار دینا چاہتے تھے اور فرعون، ہامان اور ان کے لشکروں کو ان کے ذریعے وہی کچھ دکھانا چاہتے تھے جس سے وہ ڈر رہے تھے۔

یہ اس بات کا واضح اعلان ہے کہ حکومت اور اقتدار کسی بھی طبقے یا گروہ کو غلام بنانے کے لیے نہیں ہے۔ ریاست کا ہر فرد اور ہر گروہ اپنے حقوق رکھتا ہے، ریاست اسے کسی بھی حیلے بہانے یا برتری اور کم تری کے جھوٹے احساسات کے تحت ختم نہیں کرسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اس جبر وتشدد اور فرعونیت کو برداشت نہیں کرتا۔

عدل و انصاف کا قیام

انسانوں کے درمیان مساوات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ عدل و انصاف ہو، کوئی بھی شخص ظلم و زیادتی کا ہدف نہ بننے پائے، اسلامی تعلیمات جن اساسات پر قائم ہیں ان میں سے ایک اساس عدل و انصاف ہے۔ اسلام نے عدل و انصاف کا تصور ابھارا اور اسے ایک زندہ اور فعّال تصور بنایا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیا عدل پر قائم ہے، انسان کی زندگی بھی عدل ہی کی بنیاد پر درست ہوسکتی ہے، اس لیے اسے عدل کا پابند ہونا چاہیے، انسان ظلم کی راہ پر چل پڑے تو معاشرہ لازماً بے چینی اور اضطراب سے دو چار اور سکون سے محروم رہے گا۔ اس کی تگ و تاز عدل کے دائرے میں ہو تو یہاں وہی امن و سکون ہوگا جو پوری کائنات میں نظر آتا ہے۔

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّ النَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمٰن:۵-۹)

سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے (کہ وہ اس کے مطابق گردش میں رہیں) اور پودے اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان رکھ دی کہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو۔ انصاف کے ساتھ وزن کو قائم رکھو اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ کا پورا دین صدق و عدل پر قائم ہے۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا (الانعام:۱۱۵)	تمھارے رب کی بات پوری ہے باعتبار صدق اور باعتبار عدل۔[۱]

مطلب یہ ہے کہ اس نے جو تعلیمات دی ہیں اور غیب کی جو حقیقتیں بیان کی ہیں وہ سب کی سب درست اور صحیح ہیں، ان کو غلط قرار دینے کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے اور اس نے جو احکام دیے ہیں وہ ہر طرح کے جور و ستم سے پاک اور سراسر عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد عدل و قسط کا قیام ہے۔ اسلام اس کے لیے طاقت کے استعمال کو بھی جائز قرار دیتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الحدید:۲۵)	ہم نے اپنے رسول دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا۔ اس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ بغیر دیکھے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ زور آور اور زبردست ہے۔

اسلام جس معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اس کا تصور عدل و انصاف کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ہدایت ہے کہ ظلم و زیادتی کی روش سے پوری طرح احتراز کیا جائے اور کسی بھی معاملہ میں اور کسی بھی حال میں قدم جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ پائے۔ اس نے عدل و انصاف کی ہدایت اور بغی و عدوان سے ممانعت ایک ساتھ کی ہے، اس لیے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ارشاد ہے:

۱۔ قال البیضاوی صدقا فی الاخبار والمواعید و عدلا فی الاقضیة والاحکام (تفسیر بیضاوی: ۱/ ۳۱۸ طبع بیروت ۱۹۸۸ء)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾ (النحل:۹۰)	اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو (ان کا حق) ادا کرنے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے، منکر سے اور زیادتی اور سرکشی سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

حکم ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا رویہ اختیار کیا جائے۔ یہی خدا ترس انسانوں کا طریقہ ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ (المائدة:۸)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے ہو جاؤ۔ عدل و انصاف کے شاہد بن کر۔ کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس پر ہرگز آمادہ نہ کرے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

اسلام کے نزدیک اقتدار اور حکومت قیام عدل کا ذریعہ ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں ریاست کی باگ ڈور ہے اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ ہے۔ وہ انصاف کو ہر حال میں قائم کرے گا اور ناانصافی سے اس کا دامن پاک ہوگا۔ اسلامی ریاست اپنے وسائل کو قیامِ عدل کے لیے استعمال کرے گی۔ حضرت داوٗدؑ کو خطاب کرکے فرمایا گیا:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ	اے داوٗد ہم نے تجھ کو زمین میں نائب بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کے پیچھے نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے،

بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ (صٓ:۲۶)	اس لیے کہ انھوں نے یوم حساب کو فراموش کر دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا۔

وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ (المائدۃ:۴۲)	اگر تم ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز امام عادل ان لوگوں میں ہوگا جنھیں عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ ملے گی جب کہ سوائے اس ایک سایہ کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

ان المقسطين عند الله على منابر من نور عن يمين الرحمن عزوجل وكلتا يديه يمين، الذين يعدلون فى حكمهم و اهليهم وما ولوا[2]	بے شک انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک نور کے منبروں پر جلوہ افروز ہوں گے جو رحمان عزوجل کے سیدھے ہاتھ کی طرف ہوں گے اور اس کے دونوں ہی ہاتھ سیدھے ہیں۔ انصاف کرنے والے وہ ہیں جو اپنے فیصلوں میں، اہل و عیال کے معاملہ میں اور جن کے وہ والی اور نگراں بنائے جائیں ان سب کے سلسلہ میں انصاف کرتے ہیں۔

عدل و انصاف سے متعلق اسلام کی یہ واضح ہدایات ہیں۔ ان پر صحیح معنی میں عمل درآمد ہو تو حق تلفی اور ظلم و زیادتی کی بیخ کنی ہو سکتی ہے اور ہر طرح کے استحصال سے پاک معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

۱۔ بخاری، کتاب الاذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوٰۃ الخ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ

۲۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل

قانون کی برتری

اسلام نے عدل و انصاف پر مبنی قانون ہی نہیں دیا بلکہ اس کی برتری بھی قائم کی۔ اس کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس میں چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب کا فرق نہیں ہے۔ ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کے سامنے سر جھکا دے ورنہ یہ نفاق اور ایمان کی کم زوری کی دلیل ہوگی۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾
(الاحزاب:۳۶)

یہ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کا طریقہ نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کردے تو پھر انھیں اپنے معاملہ میں اختیار باقی رہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گم راہی میں پڑ گیا۔

منافقین کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کے قبول کرنے میں انھیں تامل اور تردد ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ان کا خسارہ ہے، لیکن صحیح اور سچے اہل ایمان کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔ وہ سراپا سمع و طاعت بن جاتے ہیں اور اسے دل سے قبول کرتے ہیں۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَخْشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۵۲﴾
(النور:۵۱،۵۲)

اہل ایمان کی بات تو بس یہ ہوتی ہے جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو بس وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ یہی فلاح پانے والے ہیں۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، اللہ سے ڈرے اور اس کا تقویٰ اختیار کرے تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

قانون کی برتری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک مرتبہ قبیلہٗ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس قبیلہ کے لوگوں نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ وہ آپؐ سے سفارش کریں کہ اسے قطعِ ید کی سزا نہ دی جائے۔ اس پر نبیؐ نے حضرت اسامہؓ پر، جو آپ کو اولاد کی طرح عزیز تھے، ناگواری کا اظہار کیا اور فرمایا:

أتشفع فی حد من حدود الله	کیا تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد کے سلسلے میں سفارش کر رہے ہو؟

اس کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا۔ اس میں ارشاد فرمایا:

انما اهلک الذین قبلکم انهم کانوا اذا سرق فیهم الشریف ترکوه و اذا سرق فیهم الضعیف اقاموا علیه الحد.	تم سے پہلے کے لوگوں کو جس چیز نے تباہ کیا وہ یہی تھی کہ جب ان میں سے کوئی شریف اور معزز فرد چوری (یا اور کسی جرم کا ارتکاب) کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن اگر کوئی کم زور چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کردیتے۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد آپؐ نے قانون کی برتری کے سلسلے میں وہ الفاظ ادا فرمائے جو پیغمبر ذی شان ہی کی زبان سے ادا ہوسکتے تھے۔ فرمایا:

و أیم الله، لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدها[1]	خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ قطع کردیتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

من حالت شفاعته دون حد من حدود الله فقد ضاد الله[2]	جس کسی کی سفارش، اللہ تعالیٰ کے حدود میں سے کسی حد کے نفاذ میں حائل ہو جائے اس نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی۔

---

[1] بخاری، کتاب الانبیاء باب ۵۴۔ مسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الخ

[2] ابو داؤد، کتاب الاقضیة، باب فی من یعین علی خصومة من غیر ان یعلم امرها

ریاست حقوق کی نگراں ہے

سماج میں کسی کا کسی حیثیت سے بااختیار ہونا اسلام کے نزدیک اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرتا ہے، جس شخص کو جس حد تک بھی اقتدار حاصل ہے وہ اپنے ماتحت افراد کے حقوق کا محافظ و نگراں ہے۔ اس پہلو سے سربراہِ مملکت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الاکلکم راع، و کلکم مسئول عن رعیته فالامام الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته و الرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عن رعیته، والمرأة راعیة علی اهل بیت زوجها وولده وهی مسئولة عنهم و عبد الرجل راع علی مال سیده وهو مسئول عنه الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته[1]

سن لو! تم میں سے ہر ایک راعی اور نگراں ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ وہ شخص جو لوگوں کا امام ہے وہ راعی اور نگراں ہے۔ اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے۔ اس سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے۔ اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ آدمی کا غلام (خادم) اپنے سردار کے مال کا نگراں ہے اور اس سے اس کے بارے میں سوال ہوگا۔ ہاں! سن رکھو تم سب نگراں ہو اور تم میں سے ہر ایک سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

جرم عدالت سے ثابت ہوگا

قانون کے سلسلہ میں اسلام نے یہ اصول بیان کیا کہ ہر شخص کو بے گناہ سمجھا جائے اور اسے اسی وقت مجرم گردانا جائے جب کہ عدالت سے اس کا جرم ثابت ہوجائے۔ اس کے لیے اس نے شہادت اور گواہی کا ایک پورا تفصیلی ضابطہ مقرر کیا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللّٰہ تعالٰی اطیعوا اللّٰہ و رسوله الخ۔ مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلة الامام العادل الخ

بے ثبوت کسی کو مجرم قرار دینا یا کسی کی عزت و آبرو سے کھیلنا، اس کے نزدیک قابل تعزیر رم ہے۔ اسی ذیل میں اس نے افواہوں کو پھیلانے اور ظن وتخمین سے کام لینے سے ی منع کیا ہے۔

روایت ہے کہ عراق سے ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا اور کہا کہ ں ایک ایسے معاملے کی خبر دینے کے لیے حاضر ہوا ہوں، جس کا سر ہے اور نہ دم (جو بے سر پیر کے ہے) حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہے؟ اس نے کہا جھوٹی گواہیاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

واللہ لایؤسر رجل فی الاسلام بغیر عدول[1]	قسم خدا کی اسلام میں کوئی شخص 'عدول' (قابل اعتماد گواہوں) کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔

کسی کو قید و بند کی سزا اسی وقت دی جائے گی جب کہ قابل اعتماد شہادتوں سے ابت ہوجائے کہ واقعتاً اس نے جرم کیا ہے اور اس سزا کا مستحق ہے۔

کسی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا

بعض اوقات انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ کوئی قرض ادا نہ کر سکے تو اسے فروخت کر کے قرض وصول کیا جاتا۔ یہ ایک ناروا عمل تھا۔ سلام نے اسے ختم کیا۔ کسی کی آزادی کو سلب کرنا، اسے فروخت کرنا یا غلام کو آزاد کرنے کے بعد پھر سے اسے غلام بنا لینا اور غلاموں کی طرح اس سے خدمت لینا، یہ ساری شکلیں ممنوع ہیں۔ اس پر امت کا اجماع ہے۔ اس کی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث قدسی روایت کی ہے:

ثلاثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ، رجل اعطی بی ثم غدر، و رجل	(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) میں قیامت کے دن تین آدمیوں کا حریف ہوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرے نام سے عہد و پیان کیا

---

[1] مؤطا امام مالک، کتاب الاقضیۃ، باب ماجاء فی الشھادات

باع حراً فأكل ثمنه، و رجل استاجر اجيرا فاستوفى منه ولم يعط اجره[1]

پھر دھوکا دیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گیا اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو اجرت پر رکھا اور اس سے پورا کام لیا اور اس کی اجرت نہیں ادا کی۔

اسلام غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ کسی آزاد فرد کو غلام بنانا اس کے نزدیک سنگین جرم ہے۔ اسی طرح کسی سے خدمت لینا اور اجرت نہ ادا کرنا یا بیگار لینا سخت گناہ کا باعث ہے، جو شخص اس کا ارتکاب کرے اس کی نماز اور عبادت بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہوگی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں کرتا۔ ان میں سے ایک ہے۔

ورجل اعتبد محرره[2]

وہ شخص جس نے اپنے آزاد کردہ غلام کو پھر سے غلام بنا لیا۔

ان غیر انسانی حرکتوں کے سدِ باب کے لیے ریاست مناسب قانون وضع کرسکتی ہے۔

کسی کو ناحق سزا نہیں دی جاسکتی

حدیث میں آتا ہے کہ ناحق کسی کے کپڑے اتار لینا یا اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانا خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من جرد ظهر امرئ مسلم بغير حق لقى الله وهو عليه غضبان[3]

جو شخص ناحق کسی مسلمان کی پیٹھ کو کپڑے اتار کر برہنہ کردے وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔

---

[1] بخاری، کتاب البیوع، باب اثم من باع حرا۔ مع فتح الباری: ۵/۱۶۸

[2] ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب الرجل یؤم القوم وهم له کارهون۔ ابن ماجه، کتاب إقامة الصلوٰۃ، باب من ام قوما وهم له کارهون

[3] قال المناوی، اسناده جید، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/۴۱۲

حدیث میں اسلامی معاشرے سے خطاب ہے، اس لیے مسلمان کا ذکر ہے۔
ہی حکم غیر مسلم اور ذمی کا بھی ہے۔ اسلام کی رو سے ناحق کسی بھی فرد کو کسی قسم کی سزا
ینا سنگین جرم اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والا عمل ہے۔ سزا کے لیے جرم کا
ابت ہونا ضروری ہے، جس درجہ کا جرم ہے اسی درجہ کی سزا ہوگی۔

عزت و آبرو کا حق

انسان کے اندر خود داری اور عزت نفس کا فطری جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس کا یہ
ق ہے کہ اس کی تحقیر و تذلیل نہ ہو، اس کو بدنام اور رسوا نہ کیا جائے اور معاشرہ میں اس
کا احترام ہو اور اسے عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اسلام نے اسے اخلاقی اور قانونی
یثیت دی ہے۔ اسلام کے نزدیک کسی شریف اور مہذب انسان کی عزت و آبرو سے
کھیلنا سنگین جرم ہے۔ رسول خدا ﷺ نے پاک دامن اور سیدھی سادی عورت پر بدکاری
کے جھوٹے اور بے ثبوت الزام کو 'کبائر' (بڑے گناہ) میں شمار فرمایا ہے۔ حدیث میں
ہے کہ آپ نے 'کبائر' کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

...وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات[۱]

... اور پاک دامن، بھولی بھالی مومن عورتوں پر تہمت لگانا۔

قرآن مجید نے اس شنیع حرکت پر اَسّی کوڑوں کی سزا رکھی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ﴿۴﴾ (النور:۴)

جو لوگ پاک دامن اور شریف عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ پیش کریں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ یہی لوگ فاسق ہیں۔

آیت میں پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کا حکم بیان ہوا ہے۔ یہی حکم

---

[۱] بخاری، کتاب الوصایا، باب قول اللہ تعالیٰ ان الذین یاکلون اموال الیتمٰی ظلما۔
مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الکبائر و اکبرھا

شریف اور بااخلاق مرد کا ہے۔ اگر اس پر زنا کی تہمت لگائی جائے اور اس کا ثبوت فراہم کیا جائے تو اس کی بھی یہی سزا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تہمت لگا۔ والا مرد ہے یا عورت، بشرطیکہ وہ عاقل و بالغ ہو۔

زنا کی تہمت کے بارے میں یہ صریح حکم ہے۔ زنا کے علاوہ کوئی اور تہمت لگائی جائے جیسے فاسق و فاجر کہا جائے یا چور اور شرابی قرار دیا جائے تو اس پر یہ حد جاری نہیں ہوگی، البتہ اس کی تعزیر ہوگی۔ تعزیر میں کوڑوں کے ساتھ وقتِ ضرورت سزائے قید بھی دی جاسکتی ہے۔

اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ 'تعزیر' شریعت کی قائم کردہ 'حد' سے کم ہونی چاہیے۔ کتنی ہو، اس میں اختلاف ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

لا یجلد فوق عشر جلدات الا فی حد من حدود الله[1]

اللہ کے حدود میں سے کسی حد کے علاوہ کسی دوسرے جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ مارے نہیں جائیں گے۔

بعض دوسرے دلائل کی بنیاد پر امام ابوحنیفہؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غلام کے لیے حد قذف چالیس کوڑے ہیں۔ اس سے کم کے معنی یہ ہیں کہ تعزیر میں انتالیس کوڑے تک لگائے جاسکتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ غلام کی نہیں آزاد کی حد دیکھی جائے گی۔ آزاد شخص کے لیے حد قذف اسّی کوڑے ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب کوڑے لگائے جاتے تو وہ پچھتر (۷۵) تک شمار کرتے پھر چھوڑ دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعزیر پچھتّر (۷۵) کوڑوں تک ہوسکتی ہے۔

کم سے کم کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ تین کوڑے بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت بھی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ تعزیر یا سزا ہی نہ محسوس ہو، ورنہ اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ ایک رائے یہ ہے کہ کمی بیشی کا تعلق قاذف (تہمت لگانے والا) مقذوف (جس پر تہمت لگائی جائے) اور قذف کی نوعیت سے ہے۔ امام ان سب باتوں

---

[1] بخاری، کتاب الحدود، باب کم التعزیر والادب۔ مسلم، کتاب الحدود، باب قدر اسواط التعزیر

کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے گا۔[1]

قذف اور تہمت کا تعلق مقذوف کی عزت و آبرو سے ہے۔ اگر وہ قاذف کو معاف کردے تو کیا حد ساقط ہو جائے گی؟ امام ابو حنیفہؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس میں معاف کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سے حد ساقط نہیں ہوگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ معاف کرنا جائز ہے۔ اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔ ایک رائے یہ ہے کہ مقدمہ امام (عدالت) تک پہنچ جائے تو معافی نہیں ہوگی۔ اس سے پہلے ہوسکتی ہے۔[2]

اسلام نے عزت و آبرو کو انسان کا بنیادی حق ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کی حفاظت کے لیے مفصل قانون بھی دیا ہے۔[3]

سفر کا حق

اسلام نے انسان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ وہ اپنی دینی اور دنیوی ضروریات کی تکمیل کے لیے زمین میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کرے۔ اس نے زمین میں چل پھر کر عجائباتِ قدرت کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی ترغیب دی ہے اور آثار تاریخ کے مشاہدہ اور اس سے عبرت حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی طرح انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی اس نے سفر کی اجازت دی ہے۔ اس نے بار بار اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر کیا ہے کہ اس نے زمین کی ساخت ایسی رکھی ہے کہ انسان اپنے مقاصد کے لیے اس پر آسانی سے سفر کرسکتا ہے۔ ارشاد ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ (الزخرف:۱۰)	اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنا دیا اور تمھارے لیے اس میں راستے نکال دیے تا کہ تم منزل تک پہنچ سکو۔

---

[1] ہدایہ، کتاب الحدود، باب حد القذف

[2] ابن رشد، بدایة المجتہد: ۶/ ۱۴۰، طبع بیروت ۱۹۹۶ء

[3] اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مجموعہ مضامین 'تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث' مضمون، قذف اور لعان کے احکام، ص ۱۶۵ تا ۱۷۸

ایک اور جگہ فرمایا:

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ (نوح:۱۹، ۲۰)

اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنا دیا ہے تاکہ تم اس کے وسیع راستوں میں چلو۔

اسلام نے حالت سفر میں بعض فرائض و واجبات میں رعایتیں دی ہیں. معاشرہ کی ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ مسافروں کی مدد کرے اور انھیں سہولتیں فراہم کرے۔ بیت المال میں ان کا حق رکھا ہے اور جو لوگ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے تلاشِ معاش کے لیے سفر نہیں کر سکتے، ان کے ساتھ ہمدردی کا حکم دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان حسب ضرورت دینی اور دنیوی مقاصد کے لیے سفر کر سکتا ہے. اسلام اسے جائز قرار دیتا ہے اور اس میں مدد کرتا ہے۔ بعض حالات میں سفر اس کے نزدیک پسندیدہ عمل بھی ہے۔ اس میں غیر ضروری پابندیوں کا وہ قائل نہیں ہے۔

مظلوم کا حق

اسلام نے انسان کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ وہ خوف وخطر سے پاک اور امن امان کی زندگی گزارے۔ اس کی جان مال اور عزت و آبرو کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو۔ اس پر دست درازی ہو تو اسے اس کے خلاف آواز اٹھانے کا حق حاصل رہے۔ وہ عدالت سے رجوع کر سکے اور عوام کے سامنے بھی اپنا مقدمہ پیش کرنے کی اسے اجازت ہو۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے اظہار و اعلان کو پسند نہیں کرتا البتہ جس پر ظلم ہوا ہے (اسے اس کا حق ہے)۔

ایک طرف مظلوم کا یہ قانونی اور اخلاقی حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائے اور انصاف کا مطالبہ کرے، دوسری طرف معاشرہ کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھے اور مظلوم کی مدد کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مظلوم کی مدد کو

س کا لازمی حق بتایا ہے اور یہ بھی ہدایت فرمائی ہے کہ ظالم کی کسی پہلو سے تائید نہ ہو۔ ظلم کی حمایت روحِ اسلام کے منافی ہے۔ ارشاد ہے:

من مشی مع ظالم لیقوّیه وهو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام[1]	جو شخص کسی ظالم کے ساتھ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ظالم ہے، اسے تقویت پہنچانے کے لیے چلے تو وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔

عدل و انصاف کے قیام کے لیے معاشرہ میں مظلوم کے ساتھ تعاون اور ظالم سے عدم تعاون کی فضا کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن اس میں ریاست کے کردار کی بڑی اہمیت ہے۔

اسلامی ریاست مظلوم کو اس کا حق دلانے کی پابند ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں حکومت کی پالیسی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

الضعیف فیکم قوی عندی حتی آخذ له حقه والقوی ضعیف عندی حتّی أخذ منه الحق ان شاء اللّٰہ تعالیٰ[2]	تم میں جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہوگا۔ یہاں تک کہ میں اس کا حق لے کر اسے پہنچا دوں اور جو تم میں قوی ہے وہ میرے نزدیک ضعیف ہوگا یہاں تک کہ اس کے پاس دوسرے کا جو حق ہے وہ اس سے میں لے لوں۔ ان شاء اللہ

جب مظلوم کی پشت پر حکومت کی طاقت ہو اور وہ عدل و انصاف کے قیام کو اپنی بنیادی ذمہ داری قرار دے تو کم زور سے کم زور فرد کا بھی کوئی حق ضائع نہیں ہوسکتا۔

۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الظلم بحوالہ بیھقی شعب الایمان

۲۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۲/ ۱۹۴، ۱۹۵

بنیادی ضروریات کی تکمیل کا حق

- معاشی جدوجہد
- لباس
- مکان
- خادم اور سواری
- معاشی خوش حالی
- حکومت کی ذمے داری
- دنیا مقصود نہ بن جائے

انسان کی بنیادی ضروریات

انسانی جان کے احترام کے تصور کے ساتھ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا تصور وابستہ ہے۔ اسلام ہر انسان کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے سعی و جہد کرے۔ اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کی پوری زمین اور اس کے وسائل کو استعمال کرسکتا ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور خادم جیسی ضروریات شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اسلام نے واضح موقف اختیار کیا ہے۔ وہ ان میں سے کسی کے حصول کا مخالف نہیں بلکہ اس کی اس نے ترغیب دی ہے۔

معاشی جدوجہد

اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ اس زمین میں انسان کے رزق کا بھرپور سامان رکھا ہے۔ اس پر بسنے والے ہر فرد کا یہ فطری حق ہے کہ اسے حاصل کرنے اور فائدہ اٹھانے کی سعی و جہد کرے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ⑮ (الملک:۱۵)	وہی خدا ہے جس نے زمین کو تمھارے تابع کردیا کہ اس کے کناروں پر چلو اس کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ (الجاثیہ:۱۲، ۱۳)	اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل (رزق) تلاش کرو اور شاید کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ اس نے تمھارے لیے وہ سب چیزیں اپنی طرف سے مسخر کردیں جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہیں۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔[1]

نماز جمعہ کی اہمیت اور اس میں شرکت کو لازمی قرار دینے کے بعد فرمایا:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰﴾ (الجمعہ:۱۰)	جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ امید ہے تم فلاح پاؤ گے۔

مطلب یہ ہے کہ نماز ختم ہونے کے بعد تمھیں اجازت ہے کہ اللہ کے فضل کی تلاش میں زمین میں پھیل جاؤ۔ پوری زمین تمھارے لیے ہے۔ اس کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا تمھیں حق ہے۔

انسان اور دوسری ذی روح مخلوقات میں ایک فرق یہ ہے کہ وہ فطرتاً صاف ستھری اور پاکیزہ غذا چاہتا ہے۔ گندی اور ناپاک غذائیں اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتیں اور وہ اس کے لیے مضر صحت اور نقصان دہ بھی ہیں۔ جن غذائی اشیاء کو وہ ان کی اصل حالت میں استعمال کرتا ہے وہ بھی صاف ستھری ہونی چاہئیں اور جن چیزوں کو وہ پخت و پز کے ذریعہ خوش ذائقہ اور قابل ہضم بنا کر استعمال کرتا ہے انھیں بھی گندگی سے پاک ہونا چاہیے۔

---

[1] اس سلسلہ کی مزید آیات ملاحظہ ہوں، طٰہٰ: ۵۳، ۵۴

اسلام کے نزدیک انسان کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی سعی و جہد سے پاک اور صاف ستھری غذا حاصل کرے۔ یہ تقویٰ اور دین داری کے منافی نہیں ہے۔ البتہ اس سعی و جہد میں حلال و حرام کی پابندی ضروری ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (البقرۃ:۱۶۸،۱۶۹)

اے لوگو کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے وہ ساری چیزیں جو حلال اور پاکیزہ ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمھیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اس بات کا کہ تم اللہ کے بارے میں جھوٹی باتیں کہو جن کا تمھیں علم نہیں ہے۔

لباس

انسان کی بنیادی ضرورتوں میں لباس بھی شامل ہے۔ انسان کے لیے لباس کی اہمیت کئی پہلوؤں سے ہے۔ یہ اسے جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ جو جانور جہاں پایا جاتا ہے اس کی جسمانی ساخت وہاں کے لیے مناسب اور موزوں ہوتی ہے۔ اگر موسم سخت ہوتا ہے تو وہ دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ انسان کا حال اس سے مختلف ہے۔ اس کا جسم موسم کی گرمی اور سختی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ وہ لباس کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حیوان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس انسان کی فطرت میں شرم و حیا پائی جاتی ہے۔ عریانی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ جسم کے قابلِ ستر حصوں کو لازماً پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ فطری حیا ہی تھی کہ حضرت آدمؑ و حواؑ سے جنت کا لباس چھن گیا تو وہ درخت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھاپنے لگے۔

وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ (الاعراف:۲۲)

اور جوڑنے لگے اپنے اوپر جنت کے پتے۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ لباس انسان کے لیے وجہ زینت اور آرائش بھی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ (الاعراف:۲۶)

اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا ہے، جو تمھاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت کے لباس بھی اتارے لیکن تقویٰ کا لباس بہتر ہے۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اس طرح اسلام نے لباس اور بہتر لباس کی ضرورت اور اہمیت واضح کی ہے۔ وہ اسے انسان کی بنیادی ضرورت مانتا ہے۔ البتہ اس کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی اس ظاہری لباس کی فکر میں لباسِ تقویٰ کو نہ فراموش کر بیٹھے۔

مکان

مکان بھی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ مکان مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ

اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھر رہنے بسنے کی جگہ بنائے اور تمھارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے گھر (خیمے) بنائے کہ تم ان کو ہلکے پاتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے ٹھہرنے کے دن۔ اس نے چوپایوں کی اون سے روؤں سے اور بالوں سے ایک مدت خاص تک کے لیے ساز و سامان اور اسباب حیات بنائے۔ اللہ نے تمھارے لیے اپنی بنائی ہوئی چیزوں میں سائے رکھے اور تمھارے لیے پہاڑوں میں روپوش ہونے کے مقامات رکھے اور اس نے تمھارے لیے لباس بنائے جو تمھیں گرمی سے

تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ (النحل:۸۰،۸۱)

بچاتے ہیں اور ایسے لباس (زرہیں) بھی بنائے جو جنگ میں تمھاری حفاظت کرتے ہیں۔ اس طرح اللہ اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم اس کے فرماں بردار بنو۔

ان آیات میں تین طرح کے مکانات کا ذکر ہے۔

۱- وہ ٹھکانے جو انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں بناتا ہے، انسان نے تاریخ کے ابتدائی دور میں ممکن ہے اسے عام طور پر استعمال کیا ہو لیکن اب وہ زیادہ تر انھیں اپنی جنگی ضروریات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وقتی اور ہنگامی طور پر غیر جنگی مقاصد کے لیے بھی ان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

۲- دوسرے مکانات وہ ہیں جو خیموں اور چھول داریوں کی شکل میں بنائے جاتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی منتقل ہوسکتے ہیں۔ جنھیں خانہ بدوش استعمال کرتے ہیں۔ تفریحات یا فوجی ضرورت کے لیے بھی ان کا استعمال ہوسکتا ہے۔

۳- مکانات کی تیسری قسم وہ ہے جن کے بارے میں قرآن نے 'سکنا' کا لفظ استعمال کیا ہے جن میں انسان مستقل رہائش اختیار کرتا ہے، جن سے اس کی رہائشی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور جن میں وہ سکون اور راحت محسوس کرتا ہے۔ یہ تمدنی زندگی کا ایک لازمی جزء بھی ہے۔

ان مختلف قسم کے مکانات اور عام پوشاک اور جنگی لباس کے متعلق ان آیات میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل و احسان کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے پاس مکان ہے تو اللہ کی ایک نعمت اسے حاصل ہے۔ اس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر کسی کے پاس مکان نہیں ہے تو اس کے لیے اس کا کوشش کرنا غلط نہ ہوگا بلکہ ایک پسندیدہ عمل قرار پائے گا اس لیے کہ وہ ایک اللہ کی نعمت تلاش کرتا ہے اور اس لیے تلاش کرتا ہے تاکہ وہ اس معاملہ میں دوسروں کا محتاج نہ رہے۔

مکان ایک ضرورت ہے۔ اسلامی ریاست اپنے کارکنوں کی یہ ضرورت پوری کرے گی بلکہ اس کی کوشش ہوگی کہ ریاست کے سب ہی شہریوں کو اس کی سہولت حاصل ہو۔ اس میں وہ ممکنہ تعاون کرے گی۔ جن کے پاس مکان ہے اس پر ان کا حقِ ملکیت تسلیم کرے گی اور اس کی حفاظت کرے گی۔

خادم اور سواری

اسلام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سواری اور خادم بھی انسان کی ضرورت ہے اور وہ اسے حاصل ہونی چاہیے۔ مستورد بن شدادؓ کہتے ہیں میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے۔

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجة فان لم یکن له خادم فلیکتسب خادما فان لم یکن له مسکن فلیکتسب مسکنا و فی روایة من اتخذ غیر ذٰلک فھو غال[1]

جو ہمارا عامل (کارندہ) ہے وہ بے شادی شدہ ہے تو (بیت المال سے مدد لے کر) شادی کرلے، اگر اس کے پاس خادم نہیں ہے تو خادم حاصل کرلے، اگر اس کا مکان نہیں ہے تو مکان بنالے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص ان کے علاوہ کچھ اور بیت المال سے حاصل کرے گا وہ خائن ہوگا۔

حدیث میں ریاست کے ملازم کو اپنی حقیقی ضروریات پوری کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ اجازت کچھ حدود و قیود کے ساتھ ہوگی اور اس کا تعلق ریاست کی مالی حالت سے بھی ہوگا۔ اگر کسی کی تنخواہ ہی اس کی ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہے تو وہ ریاست کے خزانے سے مزید فائدہ اٹھانے کا مجاز نہ ہوگا۔

معاشی خوش حالی

اسلام معاشی خوش حالی کو غلط نہیں سمجھتا بلکہ اس کا وعدہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ

---

[1] ابو داؤد، کتاب الخراج و الفیٔ والامارة، باب فی ارزاق العمال

کے احکام کا پابند رہے اور اس کے ہاتھوں اللہ کے دین کی اقامت ہو جائے تو اسے معاشی خوش حالی ملے گی۔ ارشاد ہے:

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ (المائدة:٦٦)

اگر وہ (اہل کتاب) قائم کرتے توریت اور انجیل کو اور اس (قرآن) کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا ہے تو اپنے اوپر (آسمان) سے بھی کھاتے اور اپنے پیروں کے نیچے (زمین کے اندر) سے بھی۔ ان میں سے کچھ تو راہِ اعتدال پر قائم ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو برے کام کر رہے ہیں۔

مال کی اہمیت کو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اسے تسلیم کیا ہے اور اسے زندگی کے قیام و بقا کا ذریعہ کہا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (النساء:٥)

اپنے اموال، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے قیامِ حیات کا ذریعہ بنایا ہے، نادانوں کے حوالہ مت کرو۔

مال آدمی کے پاس ہو اور وہ اسے نیکی کی راہ میں خرچ کرے تو وہ قابلِ رشک ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

لا حسد إلا فی اثنین رجل اٰتاه الله مالا فسلّطه علی هلكته فی الحق و رجل اٰتاه الله الحكمة فهو يقضی بها و يعلّمها[1]

حسد (رشک) تو بس دو آدمیوں پر ہے۔ ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا اور اس نے اپنے مال کو راہِ حق میں لٹانے پر لگا دیا۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت (فہمِ دین) سے نوازا۔ وہ اس کے ذریعے فیصلہ کرتا ہے اور اس کی دوسروں کو تعلیم دیتا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحكمة، مسلم کتاب صلوٰة المسافرین، باب فضل من يقوم بالقرآن و يعلمه

حضرت سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ یحب العبد التقی الغنی الخفی[1] — بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اس بندہ سے جو صاحب تقویٰ ہے، غنی اور تونگر ہے اور پوشیدہ رہتا ہے۔

مطلب یہ کہ وہ غنی جو خاموشی سے اپنی دولت صرف کرتا ہے۔ اس کا اظہار اور نام ونمود نہیں چاہتا بلکہ اپنے آپ کو پس پردہ رکھتا ہے، اللہ کو بہت محبوب ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

نعم المال الصالح للرجل الصالح[2] — مالِ صالح اچھا ہے مرد صالح کے لیے۔

مال جائز طریقہ سے حاصل ہو اور وہ نیک ہاتھوں میں ہو تو یہ ناپسندیدہ نہیں بلکہ پسندیدہ چیز ہے۔ یہ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کا ایک عمدہ ذریعہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جائز حدود میں کسب مال کی کوشش غلط نہیں ہے۔ اسلام اس کے مواقع اور سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

حکومت کی ذمے داری

اسلامی ریاست رفاہی ریاست ہے، جو شخص بھی اپنی بنیادی ضروریات پوری نہ کر سکے اسلامی ریاست ان کی تکمیل کرے گی۔ وہ ہر اس فرد کی کفالت کی ذمہ دار ہے جو نادار ہے اور اپنا معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ رسولِ خدا ﷺ نے معاشی کفالت کا جو اعلان فرمایا اس کا ذکر حضرت ابو ہریرہؓ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے:

فلما فتح اللہ علیہ الفتوح قال انا اولی بالمؤمنین من انفسھم — جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کا دروازہ آپ پر کھول دیا تو آپ نے اعلان فرمایا: میں مومنین

---

[1] مسلم، کتاب الزہد والرقائق

[2] مسند احمد: ۴/۱۹۳ و رواہ البغوی فی شرح السنة کما فی المشکوٰۃ

فمن مات و علیه دین ولم یترک وفاءً فعلی قضاؤہ، ومن ترک مالا فلورثته، و فی روایة من ترک دینا اوضیاعا فلیاتنی فانا مولاہ وفی روایة من ترک مالا فلورثته، ومن ترک کلا فالینا۔[1]

کی جانوں سے زیادہ ان سے قریب ہوں، جس کسی کا انتقال ہو جائے، اس پر قرض ہو اور وہ اس کی ادائیگی کے لیے کوئی چیز نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہوگا اور کوئی مال چھوڑ کر جائے تو وہ اس کے ورثاء کا ہوگا، ایک روایت میں ہے جو شخص قرض یا اہل و عیال جن کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو، چھوڑ کر جائے، وہ میرے پاس آئیں، میں ان کا والی اور سرپرست ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جو مال چھوڑ کر دنیا سے جائے تو وہ اس کے ورثاء کا ہوگا اور جو کوئی بوجھ (قرض یا مفلس اہل و عیال) چھوڑ کر جائے تو وہ ہمارے ذمہ ہوگا۔

مدینہ کے ابتدائی دور میں رسول خدا ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی کا انتقال ہوتا تو آپ دریافت فرماتے کہ کیا اس پر کوئی قرض ہے اور ہے تو کیا اس نے اتنا مال چھوڑا ہے کہ اس سے قرض ادا ہو سکے؟ اگر بتایا جاتا کہ اس کے مال سے قرض کی ادائیگی ہو سکتی ہے تو آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے ورنہ فرما دیتے کہ جاؤ تم لوگ نماز پڑھ لو۔

(یہ تہدید تھی کہ لوگ قرض کے معاملہ میں بے احتیاطی سے کام نہ لیں اور مرنے سے پہلے اس کا انتظام کریں) البتہ کبھی کوئی شخص میت کی طرف سے قرض کی ادائیگی کا ذمہ لے لیتا تو آپ اس کی نماز جنازہ پڑھتے تھے۔[2] لیکن بعد کے دور میں آپ نے یہ ذمہ داری خود لے لی۔

فلما فتح الله علیه الفتوح (جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کا سلسلہ آپ کے لیے شروع کر دیا) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ریاست پر ناداروں کی کفالت یا مستحق اور مفلس قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اس وقت عائد ہوگی جب کہ وہ اس

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب البیوع، باب الفرائض، بحوالہ بخاری و مسلم۔
نیز ملاحظہ ہو باب الافلاس والانظار

[2] بخاری، کتاب الکفالة، باب الدین

موقف میں ہو۔ اس موقف میں ہوتے ہوئے اپنی اس ذمہ داری کو اپنے وسائل کے لحاظ سے پوری طرح یا حسب استطاعت وہ ادا نہ کرے تو اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرنے گی اور گناہ گار ٹھہرے گی۔[1]

دنیا مقصود نہ بن جائے

اسلام نے جائز ذرائع سے معاشی ترقی پر پابندی عائد نہیں کی ہے۔ اس معاملہ میں فرد کو ریاست کا تعاون حاصل ہوگا۔ معاشی لحاظ سے کم زور اور نادار افراد اور طبقات کی وہ مدد کرے گی۔ اس کے ساتھ اسلام اس بات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے کہ دنیا کی زندگی مقصود نہ بن جائے۔ اس کی ہوس اور اس کے حصول کی تڑپ میں انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (المنفقون:۹)

اے ایمان والو! تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کردے۔ جو ایسا کریں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

انسان بندۂ دنیا بن جائے اور مال و دولت سمیٹنے میں لگ جائے تو آخرت اس کی نگاہ سے اوجھل ہونے لگتی ہے۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ اس لیے قناعت کی تعلیم اور ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کا دائرہ محدود رکھے اور اسے زیادہ وسعت نہ دے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ليس لابن آدم حق في سوى هذه الخصال، بيت يسكنه و ثوب يواري به عورته وجلف الخبز والماء[2]

ابن آدم کا (اس دنیا میں) کوئی حق نہیں ہے سوائے ان چیزوں کے۔ گھر جس میں وہ رہے، کپڑا جس سے وہ قابل ستر مقامات کو چھپا سکے اور سوکھی روٹی اور پانی۔

---

[1] ابن حجر، فتح الباری: ۲۴۵/۵ دارالفکر۔ بیروت ۱۹۹۳ء

[2] ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی الزھادۃ فی الدنیا

حضرت بریدہ اسلمیؓ کی روایت میں اوپر کی بیان کردہ ضروریات زندگی میں بعض اور ضروریات کا اضافہ ہے لیکن ساتھ ہی قناعت کی تعلیم ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یکفی احدکم من الدنیا خادم و مرکب[۱]	تم میں سے کسی بھی شخص کے لیے اس دنیا سے ایک خادم اور سواری کافی ہے۔

ابو ہاشم بن عتبہؓ نے زندگی کے آخری لمحات میں افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ تمھارے سامنے اموال تقسیم ہوں گے۔ تمھارے لیے ان میں سے ایک خادم اور ایک سواری جو اللہ کی راہ میں جہاد کے کام آئے کافی ہے، میں نے وہ زمانہ پایا اور بہت سا مال جمع کیا۔ کاش میں اس عہد پر قائم رہتا جو آپ سے کیا تھا۔[۲]

انسان اپنی مادی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اسلام ان کی تکمیل کے لیے جائز حدود میں جدوجہد کو صحیح سمجھتا ہے اور ریاست کو اس میں تعاون کی ہدایت بھی کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ انسان بندۂ دنیا بن کر رہ جائے اور آخرت کو فراموش کردے۔

---

۱ مسند احمد: ۵/۳۶۰۔ ترمذی ابواب الزهد، باب ماجاء فی الهم فی الدنیا وحبها۔

۲ ترمذی، ابواب الزهد... ابن ماجه، کتاب الرقاق، باب الزهد فی الدنیا

سماجی و معاشرتی حقوق

- ☜ فکر کی آزادی
- ☜ عمل کی آزادی
- ☜ اظہارِ خیال کی آزادی
- ☜ خاندان بسانے کا حق
- ☜ نجی زندگی میں عدم مداخلت
- ☜ کسی کے گھر بلا اجازت داخلہ کی ممانعت
- ☜ ملک وملت کی خدمت کا حق
- ☜ تنقید اور اصلاح کا حق

سماجی و معاشرتی حقوق

انسان جس معاشرے میں رہتا بستا ہے اس میں بے جان زندگی گزارنا نہیں بلکہ موثر اور فعال کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کا فطری حق ہے اور معاشرہ بھی اسی وقت ترقی کرسکتا ہے جب کہ ہر فرد کو اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تگ و دو کے مواقع حاصل ہوں اور وہ بعض متعین حقوق و اختیارات رکھتا ہو۔ دنیا کے تمام جمہوری قوانین میں شخصی آزادی (Personal liberty) کو انسان کا ایک بنیادی حق مانا گیا ہے لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اس حق کے ذریعہ وہ دوسرے کی آزادی پر شب خون مارے اور اسے سلب کرلے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ آزادی، آزادی کو تباہ کرنے لیے نہیں ہوسکتی (There can not be freedom to destroy freedom)۔

اسی طرح قومی اور ملکی مفاد، شخصی مفاد پر مقدم ہے۔ کوئی فرد یہ حق نہیں رکھتا اور نہ اسے دیا جاسکتا ہے کہ وہ آزادی سے فائدہ اٹھا کر ملک وقوم کو نقصان پہنچائے۔ شخصی آزادی کے مختلف پہلو ہیں۔ اسلام نے ان سب کے احترام کی تعلیم دی ہے اور ان کے حدود متعین کیے ہیں۔

فکر کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و خرد عطا کی ہے۔ اس کا ایک امتیازی وصف یہی ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام اس صلاحیت کی نشو و نما اور ترقی

چاہتا ہے اور اسے دبانے اور کچلنے کی ہر کوشش کے خلاف ہے۔ اس نے انسان کو اوہام وخرافات سے نکالا، غور وفکر اور تدبر وتفکر پر ابھارا اور اس کی ترغیب دی ہے۔ اس کے نزدیک کسی معاملے میں غیر عقلی رویہ اختیار کرنا اور بے دلیل کسی بات پر اصرار کرنا انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اس نے تقلید اعمیٰ اور بے سوچے سمجھے آباء و اجداد کے طریقوں کی پابندی اور روایت پرستی پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قوموں کا یہ قدیم مرض ہے۔ اسی وجہ سے وہ تباہ ہوتی رہی ہیں۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

(الزخرف:۲۱-۲۵)

کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے جسے انھوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو، بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم ان ہی کے نقش قدم سے راہ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے آسودہ حال لوگوں نے (یہی) کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ اگر تمھارے سامنے اس سے زیادہ ہدایت اور راہ نمائی کا طریقہ پیش کروں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (تو کیا تب بھی اسے قبول نہ کروگے) انھوں نے جواب دیا کہ جو دین تم لائے ہو ہم اس کے ماننے والے نہیں ہیں۔ پھر ہم نے ان سے انتقام لیا۔ پس دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

اسلام ہر بات کو دلائل سے سمجھنے کا رجحان پیدا کرتا ہے۔ اسے اپنے مخالفین سے شکایت ہے کہ وہ فہم و دانش سے کام نہیں لیتے اور اس کے دلائل پر غور نہیں کرتے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ (الاعراف:۱۷۹)	ہم نے جن و انس میں سے بہت سوں کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سوچتے سمجھتے نہیں ہیں، ان کے آنکھیں ہیں لیکن ان سے وہ دیکھتے نہیں ہیں، ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اسلام نے غور وفکر پر زور دینے کے ساتھ انسانی عقل کی محدودیت بھی واضح کی ہے اور غور وفکر کے لیے صحیح بنیادیں فراہم کی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ عقل کا اس طرح استعمال ہو کہ آدمی راہِ ہدایت پا سکے۔

عمل کی آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حرکت وعمل کی آزادی دی ہے، وہ اپنی آزاد مرضی سے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے لیکن اس آزادی کا بے قید استعمال تباہ کن ہے۔ اس لیے اس پر کسی نہ کسی نوع کی پابندی ضروری ہے۔ اسلام نے انسان کو آزادیِ عمل کا حق دیا ہے لیکن وہ اسے کسی ایسے اقدام کی اجازت نہیں دیتا جو معاشرے کے لیے ضرر رساں اور فساد فی الارض کا موجب ہو۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جو اس دنیا میں آتے رہے ہیں، ان کا ایک خاص ہدف یہ بھی رہا ہے کہ اللہ کی زمین سے فساد اور بگاڑ کا خاتمہ ہو اور نوعِ انسانی کو امن وسکون کی زندگی میسر آئے۔

قوم مدین میں حضرت شعیب کی بعثت ہوئی تھی۔ وہ دعوت توحید کے ساتھ اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی زمین پر فساد کی روش سے باز آجائے۔ فرماتے ہیں:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ	اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔

رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸٦﴾ (الاعراف:۸۵،۸٦)	تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے۔ لہٰذا ناپ تول پورا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو اور زمین میں (اللہ کے نیک بندوں کے ذریعے) اس کی اصلاحات کے بعد فساد نہ پھیلاؤ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور راستوں پر اس لیے نہ بیٹھو کہ لوگوں کو ڈراؤ اور دھمکاؤ اور جو ایمان لائے اس کو اللہ کے دین سے روکو اور اس میں خامی ڈھونڈو۔ یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اللہ نے تمھاری آبادی میں اضافہ کیا اور غور کرو کہ فساد کرنے والوں کا (اس سے پہلے) کیا انجام ہوا۔

قوم ثمود بڑی خوش حال اور تمدنی لحاظ سے اپنے وقت کی ایک 'ترقی یافتہ' قوم تھی، لیکن اس کے لیڈروں نے فساد فی الارض کا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ حضرت صالحؑ نے اس گم راہ قیادت کے خلاف آواز اٹھائی اور قوم کو دعوت دی:

وَ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ (الشعراء:۱۵۱،۱۵۲)	اور حد سے بڑھ جانے والوں کی اطاعت نہ کرو، جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

مدینے کی اسلامی ریاست خیر و صلاح اور عدل و انصاف کا مرکز اور دنیا کے لیے اعلیٰ ترین نمونہ تھی، لیکن منافقین اسے اپنی مفسدانہ حرکتوں سے نقصان پہچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن مجید نے اسے متعدد مواقع پر بے نقاب کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ (البقرۃ:۱۱-۱۲)	جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو بس اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار رہو کہ یہی فساد کرنے والے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

سعی و جہد اور حرکت و عمل انسان کا فطری حق ہے۔ اسلام اس پر قدغن عائد نہیں کرتا البتہ وہ ان کوششوں کے خلاف ہے جو معاشرہ کو فساد اور بگاڑ کی طرف لے جاتی ہیں اور بالآخر اسے تباہی اور بربادی سے ہم کنار کرتی ہیں۔

اظہارِ خیال کی آزادی

آج کی جمہوری دنیا میں اظہارِ خیال کی آزادی کو انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا موقع ملنا چاہیے۔ دوسروں کو اسے قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن اس حق کا بے قید استعمال معاشرے کے لیے سخت نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے، اس لیے اس پر بعض پابندیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔

اسلام کے نزدیک انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اس کی زبان بندی نہ ہو، اسے اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت ہو اور وہ انھیں دوسروں کے سامنے پیش کرسکے۔ لیکن اس نے اسے بعض حدود کا پابند بھی بنایا ہے۔ یہ حدود ایسے ہیں کہ فرد اور سماج کے لیے ان کی معقولیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے جو حدود عائد کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۱- اظہارِ خیال میں آدمی اخلاقی حدود کا پابند ہو، دوسروں کی عزتِ نفس کا احترام کرے، اسے رسوا اور بدنام کرنے اور اس کی عزت و آبرو سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔ کذب بیانی، افترا پردازی، طنز و تعریض، دشنام طرازی، بدزبانی اور بدگوئی جیسی اخلاقی خرابیوں سے اجتناب کرے۔ ارشاد ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ	اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق
مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا	نہ اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں
مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى	اور عورتیں (بھی) دوسری عورتوں کا مذاق نہ

اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ (الحجرات:۱۱،۱۲)

اڑائیں، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور برے القاب سے نہ پکارو۔ ایمان کے بعد فسق کا نام لگنا برا ہے۔ جو لوگ (ان حرکتوں سے) توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان سے بچو۔ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تم اس سے گھن کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔

یہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا ایک نمونہ ہے۔ اس سلسلے کی اور اخلاقی تعلیمات قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ انھیں حسب ضرورت قانونی شکل بھی دی جاسکتی ہے اور ان کے حدود متعین کیے جاسکتے ہیں۔

۲- اظہارِ خیال کے نام پر بے حیائی اور بدکاری کے نشر و اشاعت کی اجازت نہ ہوگی۔ جو سوسائٹی اخلاق اور تہذیب و شرافت کی علم بردار ہو وہ کسی حال میں اخلاق باختگی کی تعلیم و تبلیغ کے لیے جواز نہیں فراہم کرسکتی۔ اس طرح کی ہر کوشش کو وہ سختی سے روک دے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ (النور:۱۹)

بے شک جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے درمیان بدکاری کا چرچا ہو تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں درد ناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

۳۔ ریاست میں بے چینی اور اضطراب پیدا کرنے، بدامنی پھیلانے اور ملکی فساد کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہ ہوگی۔

منافقین اور یہود اسلامی ریاست کے خلاف ہر وقت سرگرم رہتے تھے۔ ان کا یک خاص مشغلہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے درمیان غلط افواہیں پھیلائیں اور حالت جنگ میں ان کی ناکامی کی پیش گوئی کرتے رہیں اور کسی وقتی اور ہنگامی نقصان کا اس طرح چرچا کریں جیسے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے، تاکہ مسلمانوں کی ہمت پست ہو اور وہ اپنا عزم و حوصلہ کھو بیٹھیں۔ اس کا تعلق ریاست کی سلامتی سے تھا اس لیے ان کے خلاف سخت قدم اٹھانے کی ہدایت کی گئی۔

لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ لَنُغۡرِیَنَّكَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَكَ فِیۡهَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۶۰﴾ مَّلۡعُوۡنِیۡنَ ۚۛ اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ﴿۶۲﴾ (الاحزاب:۶۰،۶۱)

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹی خبریں پھیلانے والے (اپنی حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ہم ضرور آپ کو ان پر مسلط کردیں گے اور پھر وہ مدینہ میں آپ کے قریب چند دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ لعنت ہے ان پر، وہ جہاں کہیں پائے جائیں پکڑے جائیں اور بری طرح مارے جائیں۔ یہی اللہ کا طریقہ رہا ہے ان لوگوں میں جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تم اس طریقہ میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

اس تنبیہ و تہدید کے بعد منافقین کے حوصلے پست ہو گئے اور ریاست کو نقصان پہنچانا ان کے لیے آسان نہ رہا، لیکن یہود کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ ان کے خلاف اقدام کیا گیا۔ بالآخر وہ ملک بدر ہو گئے۔

خاندان بسانے کا حق

انسان کو اس کا حق ہے کہ وہ خاندانی زندگی گزارے، اس لیے کہ خاندان اس

کی ایک فطری اور سماجی ضرورت ہے۔ مہذب دنیا اس حق کو تسلیم کرتی ہے۔ خاندان کی اساس ازدواجی تعلق پر ہے۔ اسلام نے اس تعلق کو وجہِ سکون اور نسل انسانی کی بقا اور تسلسل کا جائز طریقہ قرار دیا ہے اور اس سے جو رشتے اور تعلقات وجود میں آتے ہیں ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ① (النساء:۱)

اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اللہ سے ڈرو جس کے نام سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحم (خونی رشتوں کو نقصان پہنچانے) سے بچو۔ بے شک اللہ تم پر نگراں ہے۔

اسلام خاندان کو کوئی ناپسندیدہ بوجھ نہیں قرار دیتا جس کے اٹھانے میں انسان ناگواری محسوس کرے، بلکہ یہ اس کے نزدیک اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ یہی بات اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۙ۝ (النحل:۷۲)

اللہ نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے اور تمھارے جوڑوں سے تمھیں بیٹے اور پوتے عطا کیے اور کھانے کے لیے تمھیں پاک چیزیں دیں تو کیا پھر بھی وہ باطل پر ایمان لائیں گے اور اللہ کے احسان کا انکار کریں گے۔

اسلام نے خاندان کا ایک پورا نظام عطا کیا ہے۔ اس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین کردی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ اس میں چھوٹوں سے شفقت و محبت اور بڑوں کے عزت و احترام کی تعلیم پائی

جاتی ہے۔ اس نے معاشرے کے ہر فرد کو تاکید کی ہے کہ اس نظام کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کرے اور اسے نقصان نہ پہنچنے دے۔[1]

نجی زندگی میں عدم مداخلت

انسان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اسے اپنی نجی اور شخصی زندگی میں آزادی حاصل رہے۔ اس میں بیرونی مداخلت نہ ہو۔ اسلام نے اسے اس کا ایک جائز حق قرار دیا ہے۔ اور تاکید کی ہے کہ کوئی شخص اپنے گھر یا گوشۂ تنہائی میں کیا کر رہا ہے اس کی تحقیق و تفتیش نہ کی جائے۔ اگر وہ غلط کام بھی کر رہا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ ہاں اگر وہ علی الاعلان کسی جرم کا ارتکاب کر رہا ہو یا اس کا عمل کسی دوسرے فرد یا معاشرہ کے لیے ضرر رساں ہو تو وہ قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا۔ اس سلسلہ میں اسلام نے اصولی ہدایت یہ دی ہے کہ کسی بھی شخص کو پہلے ہی قدم پر محض ظن و تخمین کی بنیاد پر غلط کار اور مجرم نہ قرار دیا جائے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بدکار و بد اطوار ہے اور اس سے کسی خیر کی توقع نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ حسنِ ظن رکھا جائے اور سوء ظن اور بدگمانی سے کام نہ لیا جائے اس لیے کہ بعض گمان بے بنیاد ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ تجسس نہ کیا جائے۔ کسی کی کم زوریوں کی ٹوہ لگانا اور چپکے چپکے اس کی خامیوں کو تلاش کرتے پھرنا غیر اخلاقی اور ناشائستہ رویہ ہے۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا	اے ایمان والو! بہت گمان سے بچو، بے شک
مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ	بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کے عیب
لَا تَجَسَّسُوْا.... (الحجرات:۱۲)	نہ تلاش کرو۔

---

[1] اس موضوع پر یہاں بہت مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے راقم کی حسب ذیل کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ 'عورت ـــ اسلامی معاشرے میں'۔ 'عورت اور اسلام'۔ 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ' اور 'اسلام کا عائلی نظام'

سوءِ ظن اور تجسس کا تعلق شخصی اور نجی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ اگر ایک شخص اجتماعی اور سماجی زندگی میں راست رو ہے تو اس کے متعلق خواہ مخواہ اس بدگمانی کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خلوت اور تنہائی میں لازماً غلط کار ہوگا۔ اس سے آگے اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے اس کے خفیہ امور کی چھان بین کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کی اصلاح کی خاطر اس کے نجی حالات سے واقف ہونے کی خفیہ کوشش بھی غلط ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تجسس سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اس سے بگاڑ کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اگر ایک شخص کے علم میں یہ بات آجائے کہ جس جرم کا ارتکاب وہ دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر کر رہا تھا اب وہ دوسروں پر کھل گئی ہے تو اس کی شرم اور جھجک ختم ہو جائے گی اور وہ اپنی غلط روی پر زیادہ جری ہوجائے گا۔ ایک حدیث میں یہی نفسیاتی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

انک اذا اتبعت عورات الناس افسدتہم[1] — جب تم لوگوں کے خفیہ عیوب کے پیچھے پڑجاؤ گے تو انھیں بگاڑ میں ڈال دوگے۔

یہی بات سربراہ مملکت سے بھی کہی گئی ہے۔ حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم[2] — بے شک امیر جب لوگوں میں ایسی چیزیں ڈھونڈنے لگے جو شک و شبہ میں ڈالتی ہیں تو ان کو بگاڑ دے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست نجی زندگی کی بھی چھان بین شروع کردے اور آدمی کے گوشۂ تنہائی کی بھی نگرانی ہونے لگے تو اس کی اصلاح نہ ہوسکے گی۔ اندرونِ خانہ بھی کسی کو آزادی سے محروم کر دیا جائے اور اس کے پیچھے جاسوس لگا دیا جائے جو خلوت

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء بحوالہ بیہقی

[2] مسند احمد: ۶/۴، ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی النہی عن التجسس

میں بھی اس کا تعاقب کرتا رہے تو اس کے اندر لازماً ردعمل پیدا ہوگا اور وہ غلط کار ہی ہے تو معصیت کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے لگے گا۔

کسی کے گھر بلا اجازت داخلہ کی ممانعت

آدمی کا گھر اس کی تنہائی اور خلوت (Privacy) کی خاص جگہ ہے۔ اس میں بے جھجک گھس پڑنا اس کی تنہائی میں مداخلت ہے۔ کسی کے گھر میں داخل ہونے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی دروازے پر کھڑے ہوکر سلام کرے اور صاحبِ خانہ کی اجازت سے اندر جائے۔ اگر اجازت نہ ملے تو واپس ہو جائے۔ اس پر ناگواری نہ محسوس کرے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨﴾

(النّور: ۲۷،۲۸)

اے ایمان والو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جاؤ، جب تک کہ ان سے انس نہ حاصل کرلو اور (اس کے لیے) ان میں رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے امید ہے تم اسے یاد رکھوگے۔ اگر تم ان مکانوں میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو ان میں مت داخل ہو، جب تک کہ تمھیں اجازت نہ مل جائے۔ اگر تم سے واپس لوٹنے کے لیے کہا جائے تو لوٹ جاؤ۔ یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر کسی کے گھر تانک جھانک کرنا اور اندرونی حالات و کوائف جاننے کی کوشش کرنا سخت معیوب ہے۔

حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکان پر تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے دروازے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ آپ کے ہاتھ میں کنگھی نما لوہے یا لکڑی کی کوئی چیز تھی جس سے آپ سرِ مبارک کھجلا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں یہ سمجھتا

کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو تو اسے میں تمھاری آنکھ میں مار دیتا۔ اجازت لینے کا حکم نگاہ ہی کی وجہ سے تو ہے (بغیر اجازت کے گھر میں جھانک کر دیکھ لینا ایسا ہی ہے جیسے آدمی بے اجازت گھر میں داخل ہو جائے)۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

لو اطلع فی بیتک احد ولم تأذن له فخذفته بحصاة ففقأت عينه ما كان عليك من جناح[2]	اگر کوئی شخص تمھارے گھر مین جھانکے، تم نے اسے اجازت نہ دی ہو، اس حرکت پر تم کوئی کنکر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

ان احادیث سے امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ گھر میں کسی کے تانک جھانک کرنے پر صاحب خانہ اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر دیت یا تاوان لازم نہیں آئے گا۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ تہدید کا انداز ہے، اس میں کوئی قانون نہیں بیان ہو ہے۔ اس بحث سے قطع نظر اس سے اس مسئلہ میں اسلام کا مزاج بہرحال سمجھا جاسکتا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب ترین عزیزوں کے گھر میں بھی آدمی کو اجازت لے کر ہی داخل ہونا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنی ماں سے بھی (اس کی رہائش گاہ میں جانے کے لیے) اجازت لوں؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس نے عرض کیا کہ میں تو اسی کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا پھر بھی اجازت لو۔ اس نے کہا میں تو اس کا خادم ہوں۔ آپ نے فرمایا اجازت لے کر ہی اس کے پاس جاؤ۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اسے برہنہ دیکھو۔ اس نے کہا نہیں! آپ نے فرمایا: پھر تو تمھیں اجازت

---

1. بخاری، کتاب الدیات، باب من اطلع فی بیت قوم الخ مسلم کتاب الآداب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ۔
2. بخاری کتاب الدیات، باب من اخذ حقه اواقتص دون السلطان۔ مسلم، کتاب الآداب، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ۔

ینی چاہیے۔ (ورنہ کوئی بھی ناپسندیدہ حالت دیکھنی پڑ سکتی ہے) [1]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے خلوت میں عدم مداخلت کو کتنی ہمیت دی ہے اور معاشرہ کو اس حق کے احترام کا کس قدر پابند بنایا ہے۔

ملک و ملت کی خدمت کا حق

ملک و ملت کی فلاح و بہبود کی فکر اور اس کے لیے تگ و دو کرنا، ریاست یا کسی خاص فرد یا گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ریاست کے ہر شہری کا حق ہے کہ اسے ملک اور ملت کی خدمت کا موقع حاصل ہو اور اس پر غیر ضروری پابندی نہ لگائی جائے۔ اسلام نے تعلیمی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی، سیاسی ہر طرح کی خدمت کی ترغیب دی ہے اور اس پر معاشرہ کو آمادہ کیا ہے۔ قرآن نے اس کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ط
(النساء:۱۱۴)

ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے اس شخص کے جس نے صدقہ یا معروف کا حکم دیا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی کوشش کی (اس نے کار خیر انجام دیا)۔

کتاب و سنت کے علم کو عام کرنے کی جدوجہد اسلام کے نزدیک بہترین جدوجہد ہے۔

حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خیر کم من تعلم القرآن و علمه [2]

تم میں بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔

آدمی کا صحت مند اور تندرست ہونا اور دوسروں کی فلاح کے لیے کام کرنا اسلام

---

[1] رواہ مالک فی الموطا مرسلا۔ کتاب الجامع، باب الاستیذان.

[2] بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب ۲۱۔ ترمذی کتاب ثواب القرآن، باب ماجاء فی تعلیم القرآن.

کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ک
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

المومن القوی خیر و احب الی الله من المومن الضعیف و فی کل خیر[1]

طاقت ور اور قوی مومن اللہ کے نزدیک بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے اس مومن سے ج کم زور اور ضعیف ہے (اس کے باوجود ہر ایک میں خیر ہے۔

خدمت کی راہ میں تکلیف برداشت کرنے، صبر و ثبات کے ساتھ اسے جاری رکھنے اور ہمت ہار کر نہ بیٹھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

المسلم الذی یخالط الناس و یصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالطھم ولا یصبر علی اذاھم[2]

جو مسلمان لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے، وہ افضل اور برتر ہے اس مسلمان سے جو ان سے میل جول رکھتا ہے نہ ان کی تکلیف پر صبر کرتا ہے۔

افراد اور گروہوں کے نزاعات کو ختم کرنا اور ان کے درمیان تعلقات کو بحال کرنا معاشرہ کی بہترین خدمت اور بہت بڑا کار ثواب ہے۔ اس کی فضیلت نفل عبادات سے زیادہ ہے۔ حضرت ابودرداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الا اخبرکم بافضل من درجة الصیام و الصدقة والصلوٰة قال قلنا بلیٰ قال اصلاح ذات البین و

کیا میں تمھیں بتاؤں کہ (نفل) روزہ صدقہ و خیرات اور نماز سے اعلیٰ درجہ کا عمل کون سا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ ضرور بیان فرمایئے آپ نے

---

[1] مسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوة الخ

[2] مسند احمد: ۲/۴۳۔ ترمذی، کتاب صفة القیامة، باب ۵۰۔ ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء

فساد ذات البین هی الحالقة[1]

فرمایا وہ ہے آپس کے تعلقات کو ٹھیک کرنا اور آپس کے تعلقات کا بگاڑ تو (دین و دنیا کو) مونڈ دینے والی چیز ہے۔

دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا حق بھی ہر ایک کو حاصل ہوگا۔ اس کا ثبوت حضرت ام حبیبہؓ کی روایت سے ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کل کلام ابن آدم علیہ لا لہ، الا امر بالمعروف او نهی عن منکر او ذکر اللہ[2]

امر بالمعروف، نہی عن المنکر یا اللہ کے ذکر کے سوا ابن آدم جو بھی کلام کرتا ہے وہ اس کے لیے نقصان دہ ہی ہے، سود مند نہیں ہے۔

اس طرح اسلام ہر شخص کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ معاشرہ کی فلاح اور انسانوں کی خدمت کے لیے سعی و جہد کرے، اس کے لیے قوت و طاقت اور صلاحیت پیدا کرے اور خدمت کو بڑے اجر و ثواب کا کام سمجھ کر اسے انجام دے۔

تنقید اور اصلاح کا حق

اللہ تعالیٰ کے رسول دنیا میں حق کی تبلیغ اور معاشرہ کی اصلاح کا فرض انجام دیتے ہیں اور ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہوکر انجام دیتے ہیں:

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۳۹
(الاحزاب:۳۹)

وہ اصحاب (پیغمبر) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے کسی سے خوف نہیں کھاتے۔ اللہ حساب لینے کے لیے کافی ہے۔

معاشرہ میں جو خرابیاں پائی جائیں ان پر تنقید اور اصلاح کا اسلام نے ہر ایک کو حق دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[1] مسند احمد: ۶ / ۴۴۴۔ ترمذی، کتاب صفة القیامة، باب ۵۶۔ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البین

[2] ترمذی، کتاب الزهد، باب ماجاء فی حفظ اللسان۔ ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة

قل الحق ولو كان مرا	یعنی حق بات کہو چاہے وہ کسی کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔

مزید یہ کہ:

لا تخف في الله لومة لائم[1]	اللہ کے (دین کے) معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کرو۔

منکرات پر تنقید اور ان کے ازالے کی سعی کو رسول اللہ ﷺ نے تقاضائے ایمان قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه و ان لم يستطع فبقلبه و ذالک اضعف الايمان[2]	تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ (قوت) سے بدل دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے اسے بدلے۔ اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے برا سمجھے۔ یہ (تقاضائے) ایمان کا کم زور درجہ ہے۔

حکومت اور ریاست کے اقدامات کی تائید اور حمایت یا اعتراض وتنقید کے معاملہ میں اسلام نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ اس کی حمایت معروفات میں کی جائے گی۔ اگر اس کے ذریعہ شریعت کا نفاذ عمل میں آ رہا ہے اور وہ معاصی سے اجتناب کر رہی ہے تو اس کا ساتھ دیا جائے گا، لیکن اگر وہ منکرات کو فروغ دے رہی ہے تو اس کے ساتھ تعاون نہ ہوگا اور اس سے دوری اختیار کی جائے گی۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] مشكوٰة المصابيح، كتاب الآداب، باب حفظ اللسان، بحواله بيهقى روايت حضرت ابو ذرؓ۔

[2] مسلم، كتاب الايمان، باب بيان كون النهى عن المنكر من الايمان۔ ابو داؤد، كتاب الملاحم، باب الامر والنهى۔

لا طاعة فی معصية انما الطاعة فی المعروف[1]	معصیت میں اطاعت نہیں ہوگی، اطاعت تو معروف میں ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

السمع والطاعة علی المرء المسلم فيما احب وکره مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة[2]	مرد مسلم کے لیے ضروری ہے کہ اپنے امیر کی بات سنے اور اس کی اطاعت کرے اس معاملہ میں بھی جسے وہ پسند کرتا ہے اور اس معاملہ میں بھی جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ جب تک کہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ جب معصیت کا حکم دیا جائے تو بات سنی جائے گی اور نہ اطاعت ہوگی۔

نواس بن سمعانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق[3]	خالق کی معصیت کے معاملہ میں کسی مخلوق کی بات نہیں مانی جائے گی۔

اسلام، فرد کو سماج میں متحرک اور باعمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے بہترین راہ نما خطوط بھی فراہم کر دیے ہیں۔ ان کی پابندی ہو تو سماج شر و فساد کے خارزار سے پاک ہو سکتا اور امن و امان اور خیر و صلاح کا گلستان بن سکتا ہے۔

۱؎ بخاری، کتاب اخبار الآحاد، باب ماجاء فی اجابة خبر الواحد الخ۔ مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء فی غير معصية.

۲؎ بخاری، کتاب الاحکام، باب السمع والطاعة للامام مالم تکن معصية۔ مسلم، کتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء فی غير معصية.

۳؎ مشکوٰة المصابيح، کتاب الامارة والقضاء بحواله شرح السنة.

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

- عورت کے حقوق
- بیوی کے حقوق
- بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کے حقوق
- یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق
- غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق
- محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق
- ضعیفوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق

کم زور افراد اور طبقات کے حقوق

معاشرے میں جسمانی، دماغی، معاشی اور سماجی لحاظ سے کم زور افراد اور طبقات پہلے بھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں اور دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں ہیں۔ کم زوروں کی تاریخ ان کے حقوق کی پامالی کی تاریخ ہے۔ انھوں نے ظلم و زیادتی کے نرغے میں زندگی گزاری ہے اور بنیادی حقوق تک سے انھیں محروم رکھا گیا ہے۔ سماج کے کم زور افراد اور طبقات پر جو مظالم ہو رہے تھے اسلام نے شروع ہی سے ان کے خلاف پر زور آواز اٹھائی، ان کے حقوق کا علم بلند کیا اور ان کے محافظ کی حیثیت سے سامنے آیا۔ زور آوروں کے ظلم کی چکی میں نادار، یتیم، مسکین اور معذور پس رہے تھے، قرآن نے وقت کے جابروں اور ظالموں کو سخت تنقید کا ہدف بنایا اور ان کے ظلم پر آخرت کی وعید سنائی۔ اس کے ساتھ کم زور اور محروم افراد کے قانونی حقوق واضح کیے اور افلاس و غربت کی وجہ سے سماج میں جن کا درجہ کم تر سمجھا جاتا تھا انھیں مساوی اور برابر کا درجہ عطا کیا۔ یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

عورت کے حقوق

عورت کے ساتھ ہر زمانہ میں ظلم ہوتا رہا ہے۔ مرد نے اسے برابر کی حیثیت نہیں دی، اسے فروتر سمجھا، اس کے حقوق پامال کیے اور اس کے ساتھ غیر اخلاقی بلکہ بسااوقات غیر انسانی رویہ اختیار کیا۔ عورت اپنی طبعی کم زوری کی وجہ سے یہ سب

برداشت کرتی رہی اور شاید کبھی احتجاج کی بھی جرأت نہیں کی۔

خواتین کے ساتھ عرب کی سوسائٹی میں بدترین سلوک کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو باعثِ ننگ سمجھا جاتا، بعض اوقات انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا، ان کی موت کو ان کی حیات سے بہتر تصور کیا جاتا، ان کے مالی حقوق نہ تھے، وراثت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ زندہ بھی ہوتیں تو بوجھ سمجھی جاتیں، بوجھ ہی سمجھ کر ان کی پرورش ہوتی تھی۔ اس صورتِ حال کے خلاف اسلام نے آواز اٹھائی، سماج میں انھیں برابر کا مقام دیا اور ان کے خلاف ہر طرح کی دست درازی کو جرم قرار دیا۔ جایداد میں ان کا حق مقرر کیا، ازدواجی زندگی میں عورت و مرد کے حقوق و فرائض متعین کیے، معاشرہ میں انھیں اپنا رول ادا کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ عورت کو مرد کا ضمیمہ نہیں قرار دیا بلکہ اس کی انفرادیت کا اعلان کیا اور کہا کہ دونوں خدا کے بندے ہیں اور اس کے سامنے جواب دہ ہیں، ان میں سے جو حسنِ عمل کا توشہ لے کر اس کے حضور پہنچے گا وہ کام یاب ہوگا اور جو اس سے خالی ہوگا وہ ناکام و نامراد ہوگا۔

بیوی کے حقوق

میاں بیوی کا تعلق انسانوں کے درمیان قریب ترین تعلق اور خاندان کی اساس ہے۔ اسلام نے اس تعلق کا احترام کرنے اور اسے استوار رکھنے کی ہدایت کی ہے اور مرد سے کہا ہے کہ بیوی کی کوئی بات ناپسند ہو تو اسے نظر انداز کرکے اس کے ساتھ معروف کے مطابق رویہ اختیار کرے۔ وہ رویہ معروف کہا جائے گا جسے ہر شریف اور مہذب انسان معقول کہے اور جسے معاشرہ پسندیدہ نظر سے دیکھے۔ قرآن مجید کی ہدایت ہے۔

وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾ (النساء:۱۹)

اور بھلے طریقے سے ان کے ساتھ برتاؤ کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھی ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔

حضرت معاویہ قشیریؓ نے آپؐ سے بیوی کے حقوق دریافت کیے تو فرمایا:

ان تطعمها اذا طعمت و تكسوها اذا اكتسيت ولا تضرب الوجه ولا تقبّح ولا تهجر الا في البيت[1]	جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ۔ (غصہ سے بے قابو ہوکر) اس کے منہ پر مت مارو۔ اس کو برا بھلا مت کہو (اس سے کنارہ کشی کرنی ہو تو گھر سے مت نکال دو بلکہ) گھر ہی کے اندر اس سے علیٰحدہ رہو۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

اَطْعِمُوْهُنَّ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَ اكْسُوْهُنَّ مِمَّا تَكْتَسُوْنَ وَلَا تَضْرِبُوْهُنَّ وَلَا تُقَبِّحُوْهُنَّ[2]	تم جو کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کو مار پیٹ مت کرو اور برا بھلا مت کہو۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں انسان کا جو معیار ہے وہی اس کی بیوی کا بھی ہونا چاہیے۔ خود اعلیٰ معیار کے ساتھ رہنا اور اسے کم تر معیار کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ میل جول اور تعلقات میں شریفوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے۔ جہالت اور بربریت کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اكمل المؤمنين ايمانا احسنهم خلقا و خياركم خياركم لنساء هم[3]	ایمان والوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہوں۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی حق المرأة علی زوجها

[2] حوالہ سابق

[3] ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأة علی زوجها

مطلب یہ کہ اخلاق کی بلندی ہی سے ایمان کا اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے، جو شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرے وہ معاشرہ کا بہترین فرد ہے۔

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کے حقوق

عورت پر اس کے شوہر نے بھی ظلم و زیادتی کی ہے لیکن اس کے باوجود بیوی کے لیے بہرحال اس کے دل میں نرم گوشہ رہا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان بڑا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی الفت و محبت بھی بے مثال سمجھی گئی ہے۔ ان کے مفادات بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ عورت اس کے بچوں کی ماں اور اس کے گھر کی منتظمہ ہوتی ہے اور مرد اس کی جان، مال اور عزت و آبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عورت جذباتی طور پر سب سے زیادہ اپنے شوہر سے قربت محسوس کرتی اور زندگی کی تگ و دو میں اس کی رفاقت کو سب سے زیادہ اہم تصور کرتی ہے۔ عورت کی حیثیت یوں بھی کم زور رہی ہے اور جب اس کا یہ سہارا ختم ہو جاتا تو اس کی حیثیت اور زیادہ مجروح ہو جاتی۔ وہ اپنی حفاظت اور نگہ داشت کرنے والے سے محروم ہوکر ہر طرف سے ظلم و ستم کا نشانہ بن جاتی۔

عورت اگر بیوہ ہوتی ہے تو خدا کی قدرت اور حکمت کے تحت ہوتی ہے۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا، لیکن دنیا کی بیشتر قوموں کے نزدیک عورت کے لیے بیوگی بہت بڑا داغ تھی۔ اسے منحوس اور بد قسمت سمجھا جاتا اور ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ معاشرے میں اس کی قدر و منزلت باقی نہ رہتی اور اس کی عزت و آبرو ختم ہوجاتی۔ اس کے اندر اپنی محرومی اور بد نصیبی کا اتنا شدید احساس پیدا ہو جاتا کہ بسااوقات وہ خودکشی پر مجبور ہوجاتی اور زندہ بھی رہتی تو اس طرح کہ موت اس زندگی سے بہتر ہوتی۔ آج بھی بہت سے معاشروں میں بیوہ کا یہی حال ہے۔ اس پہلو سے بیوگی عورت کے لیے ایک سماجی اور نفسیاتی سانحہ بھی ہے۔ جس عورت کے ساتھ یہ سانحہ پیش

آئے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ ہمارے حسنِ سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیواؤں اور مسکینوں کی خدمت اور تعاون اور اس سلسلے میں تگ و دو کو راہِ خدا میں جہاد اور شب و روز کی نفل عبادت کے برابر قرار دیا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

الساعی علی الارملة والمسکین کا لمجاهــــد فی سبیل الله و احسبه قال و کالقائم لا یفترو کالصائم لایفطر[1]

بیوہ اور مسکین کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جو اللہ کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو مسلسل اللہ کی یاد میں کھڑا رہتا ہے اور لگاتار روزے رکھتا ہے۔

اسلامی قانون کے تحت عورت بیوہ ہونے کی وجہ سے اپنے قانونی حقوق سے محروم نہیں ہوتی۔ شوہر کے ترکہ یا وراثت میں اس کا حصہ متعین ہے۔ اگر اس کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے تو شوہر کے بعد اس کا نان نفقہ اس کی اولاد یا ماں باپ پر لازم ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسے دوسرے نکاح کا حق ہے۔ وہ اپنی آزاد مرضی سے دوبارہ ازدواجی زندگی شروع کرسکتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں بیوہ سے نکاح کا رواج رہا ہے۔ یہ اس کے بہت سے مسائل کا حل ہے۔

یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق

یتیم اصطلاح میں اس نابالغ بچہ کو کہا جاتا ہے جسے اپنے باپ کا سایہ نصیب نہ ہو لیکن جس بچہ کی ماں نہ ہو اسے بھی اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے یتیم کہا جاسکتا ہے۔ کسی بھی بچے کے لیے یتیمی سب سے بڑا سانحہ ہے۔ ماں باپ کے نہ ہونے کی وجہ

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی المسکین۔ مسلم، کتاب الزهد، باب فضل الاحسان الی الارملة

سے وہ اپنے قریب ترین ہمدردوں اور حقیقی سرپرستوں سے محروم ہوتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت اور روز گار ہی کے لیے نہیں بلکہ بسا اوقات اپنی نگہ داشت اور پرورش کے لیے بھی دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے اپنی اولاد کی طرح دیکھنا، اس کی پرورش کی زحمت برداشت کرنا، اس کی تعلیم و تربیت کا بوجھ اٹھانا اور اسے اس قابل بنانا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے آسان نہیں ہے۔ لیکن جو شخص یہ مشکل کام انجام دے اسے آخرت میں رسول اکرمﷺ کی قربت اور معیت کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ حضرت سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

انا وکافل الیتیم فی الجنة ھٰکذا وقال باصبعیه السبابة والوسطی[1]

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح قریب ہوں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

قرابت دار کا حق مقدم ہے اور اس کی خدمت کا اجر وثواب زیادہ ہے، لیکن اگر یتیم سے قرابت اور رشتہ داری کا تعلق نہ ہو تو بھی اس کی نگہ داشت اور کفالت پر وہی اجر وثواب ملے گا جو کسی قرابت دار یتیم کی کفالت پر ملتا ہے۔ اسے بھی رسول اللہﷺ نے قیامت میں اپنی رفاقت کی بشارت دی ہے۔ چناں چہ مذکورہ بالا حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

کافل الیتیم له او لغیره انا وھو کھاتین فی الجنة[2]

یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا ہو یا کسی دوسرے کا، وہ اور میں جنت میں اس طرح قریب ہوں گے (جیسے یہ دو انگلیاں ہیں)

امام نوویؒ فرماتے ہیں۔ یتیم کی کفالت کا مطلب ہے اس کے کھانے کپڑے اور تعلیم و تربیت وغیرہ کا بندوبست کرنا۔ یہ فضیلت اس شخص کو بھی حاصل ہوگی جو اپنے

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیما

[2] مسلم، کتاب الزھد، باب فضل الاحسان الی الارملة

پیسہ سے یہ خدمت انجام دے اور اس شخص کو بھی جو یتیم ہی کا مال شریعت کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت ان مدات میں خرچ کرے۔[1]

مالک بن الحارثؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے:

من ضم یتیما بین ابوین مسلمین الی طعامه و شرابه حتی یستغنی عنه وجبت له الجنة[2]	جو شخص کسی یتیم کو جو مسلمان ماں باپ سے ہو، اپنے کھانے پینے میں اس وقت تک ساتھ رکھے جب تک کہ وہ (بڑا ہوکر) اس سے بے نیاز ہوجائے تو اس کے لیے جنت واجب ہوگی۔

اس سلسلے کی ایک اور حدیث حضرت عبد اللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من عال ثلثة من الایتام کان کمن قام لیله و صام نهاره و غدا وراح شاهرا سیفه فی سبیل الله و کنت انا وهو فی الجنة اخوان کما ان هاتین اختان والصق اصبعیه السبابة والوسطی[3]	جو شخص تین یتیموں کی پرورش کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے رات میں قیام کیا، دن میں روزہ رکھا اور صبح و شام اپنی تلوار لیے ہوے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا رہا۔ میں اور وہ جنت میں اس طرح قریب ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے انگشت شہادت اور درمیان کی انگلی ملائی۔

عورت اور یتیم کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور ان کی حق تلفی سے رسول اکرمؐ نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:

---

۱ نووی، شرح مسلم، جلد:۹ جزء:۱۸، کتاب الزهد والرقائق باب، الاحسان الی الارملة والمسکین والیتیم.

۲ مسند احمد، ۴/۳۴۴ قال المنذری اسناده حسن، الترغیب والترهیب، کتاب البر والصلة، باب الترغیب فی کفالة الیتیم و رحمته... الخ ۳/۲۳۵

۳ ابن ماجه، کتاب الادب، باب حق الیتیم.

اللّٰھم انی احرج حق الضعیفین الیتیم و المرأۃ[1]

اے اللہ جو شخص ان دو کم زوروں۔ یتیم اور عورت کا حق ضائع کرے میں اسے خطا کار اور مجرم ٹھہراتا ہوں (اور اس سے بچنے کی اسے تاکید کرتا ہوں)

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یحسن الیہ و شر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یساء الیہ[2]

مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔

یتیم کم سمجھ اور ناتجربہ کار ہوتا ہے۔ اسے اپنے نفع و نقصان کا پوری طرح احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے آسانی سے اس کا حق مارا جاسکتا اور اسے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ اسلام نے سختی سے اس کی ممانعت کی ہے۔ اس نے کہا یتیم صاحبِ حیثیت ہو تو اس کے مال و جایداد کی حفاظت کی جائے، اسے ترقی دینے کی کوشش کی جائے اور اس سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اس کے مال میں تصرف ہو تو بھلے طریقے سے ہو، اسے برباد کرنے کے ارادے سے نہ ہو۔ چناں چہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ (الانعام:۱۵۱)

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہترین ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔

جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں انھیں اس نے ان الفاظ میں جہنم کی وعید سنائی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰ (النساء:۱۰)

بے شک وہ لوگ جو یتیموں کے مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

---

[1] مسند احمد: ۴۳۹/۲، ابن ماجہ، کتاب الادب، قال النووی حدیث حسن رواہ النسائی باسناد جیّد، ریاض الصالحین ص ۱۲۲

[2] ابن ماجہ، کتاب الادب، باب حق الیتیم۔ الادب المفرد: ۲۳۱/۱

رسول اللہ ﷺ نے سات گناہوں کو 'موبقات' (ہلاک کردینے والے گناہ) سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں ایک یتیم کا مال کھانا بھی ہے۔[۱]

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ یتیموں کے سرپرستوں نے ان کے کھانے پینے تک کا نظم الگ کر دیا۔ اس لیے کہ مشترک نظم میں اس بات کا ڈر تھا کہ ہزار احتیاط کے باوجود یتیم کی کوئی چیز اور اس کے مال کا کوئی جزء ان کے حصہ میں آجائے اور ان کا شمار بھی اس کا مال کھانے والوں میں ہو جائے۔ یہ احتیاط اس قدر بڑھی کہ ان کا کھانا بچ جاتا تو حفاظت سے رکھ دیا جاتا تاکہ وہ خود ہی دوبارہ اسے استعمال کریں۔ بسا اوقات وہ خراب بھی ہو جاتا لیکن یتیم کے سرپرست اسے اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے انتظام میں سخت زحمت پیش آرہی تھی۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو انھوں نے دوبارہ اپنا اور ان کا مشترک نظم رکھا۔[۲]

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۝۲۲۰
(البقرۃ:۲۲۰)

وہ تم سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ ان کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے) کہو جس میں ان کی بھلائی ہو وہ بہتر ہے۔ اگر تم ان کو کھانے پینے اور رہنے سہنے میں اپنے ساتھ ملا کر رکھو تو (بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ) وہ تمھارے بھائی ہیں، اللہ جانتا ہے کون بگاڑنے والا ہے اور کون بنانے اور سنوارنے والا۔ اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اس میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یتیم کے مال کے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جائے جو اس کے حق میں مفید اور بہتر ہو۔ جیسا کہ فقہا نے لکھا ہے اس کی

۱۔ بخاری، کتاب الحدود، باب رمی المحصنات۔ مسلم کتاب الایمان، باب بیان الکبائر و اکبرھا.

۲۔ ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب مخالطة الیتیم فی الطعام۔ نسائی، کتاب الوصایا، باب ما للوصی من مال الیتیم

بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اس کا مال کسی مناسب کاروبار میں لگایا جائے۔ محنت اور سرمایہ کے اصول پر کسی محنتی اور تجربہ کار آدمی کے حوالے کیا جائے۔ سرپرست کو اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ خود ہی یتیم کے مال سے تجارت کرے یا کسی دوسرے کی تجارت میں اس کا سرمایہ لگائے۔ یتیم کے ساتھ خیر خواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے یا اسے کسی ہنر اور صنعت و حرفت کے سیکھنے میں لگایا جائے۔ بعض اوقات خیر خواہی کا تقاضا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا کوئی معقول رشتہ کرا دیا جائے۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ وہ تمھارے بھائی ہیں۔ مطلب یہ کہ تمھیں ان کے ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیے جو تم اپنے ایک بھائی کے ساتھ کرسکتے ہو[1]

ایک جگہ یتیموں کے سرپرستوں سے قرآن مجید نے کہا کہ تم ان کے مال کے محافظ اور نگراں ہو، تمھارا کام اس کی حفاظت اور نگہ داشت ہے۔ جب وہ سنِ شعور کو پہنچ جائیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو، ان کے بڑے ہونے سے پہلے اسے کھا پی کر ختم نہ کردو۔ خدا نے تمھیں وسعت اور فراخی عطا کی ہے تو بہتر یہ ہے کہ کسی معاوضہ کے بغیر ان کی خدمت کرو۔ لیکن اگر تنگ دست اور حاجت مند ہو تو دستور کے مطابق اپنی اجرت اور معاوضہ تو لے سکتے ہو، بے دردی سے اڑا نہیں سکتے۔

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (النساء:٦)

یتیموں کو آزما کر دیکھو۔ یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر جب تم ان کے اندر ہوشیاری اور سوجھ بوجھ دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور جلدی جلدی (اس خیال سے) مت کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہوکر اس کا مطالبہ کریں گے۔ جو صاحبِ حیثیت ہے وہ اس سے بچا رہے اور جو محتاج ہے وہ معروف طریقے سے کھائے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے جصاص، احکام القرآن: ۱/ ۴۰۰، ۴۰۱

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں بالکل غریب اور نادار ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے، البتہ ایک یتیم کی نگہ داشت کرتا ہوں، کیا اس کے مال سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا:

کل من مال الیتیم غیر مسرف ولا مبادر ولا متاثل[1]

یتیم کے مال سے تم کھاسکتے ہو لیکن نہ تو ضرورت سے زیادہ اور نہ جلدی جلدی اور نہ اس طرح کہ اس کا اصل سرمایہ ہی ختم ہو جائے۔

غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق

دنیا میں قدیم ترین زمانے سے غلامی کا رواج رہا ہے اور جب سے اس کا رواج ہے غلاموں کے ساتھ ظلم و زیادتی بھی ہوتی رہی ہے۔ غلام کو نہ تو جدوجہد اور تگ و دو کی آزادی تھی اور نہ کسی چیز پر اس کا حق ملکیت ہی تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی جان و مال، اس کی صلاحیتوں اور اس کے اوقات پر اس کے مالک کا پورا اختیار ہوتا۔ وہ جس طرح چاہتا اس کے ساتھ معاملہ کرتا۔ بعض اوقات غلاموں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا ہے جو جانوروں کے ساتھ بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ پھر یہ کہ اس ظلم و زیادتی پر ان کو شکوہ و فریاد تک کی اجازت نہیں رہی ہے۔ اسی طرح بادشاہوں نے رعایا کے ساتھ، حاکموں نے محکوموں کے ساتھ، امیروں اور رئیسوں نے نوکروں اور خادموں کے ساتھ، زور آوروں اور طاقت والوں نے زیر دستوں اور کم زوروں کے ساتھ ہر طرح کی ظلم و زیادتی کی اور ان کے جائز حقوق کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ اسلام نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ہر زیر دست اور محکوم کے حقوق متعین کیے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی۔ اس کا اندازہ ان ہدایات سے ہوسکتا ہے، جو اس نے غلاموں کے سلسلے میں دی ہیں۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی مالولی الیتیم

ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فاعینوهم[۱]	بلاشبہ تمھارے بھائی تمھارے غلام ہیں۔ اللہ نے ان کو تمھارے زیر دست کر رکھا ہے۔ پس جس کسی کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے وہ کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ ان پر کام کا اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ اسے وہ اٹھا نہ سکیں۔ اگر ان کی طاقت سے زیادہ انّ کو کام دو تو اس کے پورا کرنے میں ان کی مدد کرو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

للمملوک طعامه و کسوته ولا یکلّف الا ما یطیق[۲]	غلام کا حق ہے کہ اسے کھانا اور لباس فراہم کیا جائے اور اسے اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: علماء کا اس پر اجماع ہے کہ مالک جو کھائے اور جو پہنے وہی غلام کو کھلانا اور پہنانا فرض تو نہیں البتہ مستحب ہے۔ فرض یہ ہے کہ شہروں اور علاقوں کا بھی اور افراد کا بھی جو دستور ہو اس کے مطابق اسے کھانا کپڑا دیا جائے اور اس کی دوسری ضرورتیں پوری کی جائیں، چاہے یہ وہی کھانا کپڑا ہو جو مالک استعمال کرتا ہے یا اس سے فروتر یا اس سے برتر۔ اگر مالک اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر یا بخیلی کی وجہ سے اپنی سطح کے لوگوں کے معیار سے کم تر درجہ کی زندگی گزار رہا ہو تو وہ غلام کو اس کی مرضی کے بغیر اس طرح کی زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ علماء کا اس پر بھی اجماع ہے کہ غلام کی طاقت سے زیادہ مالک اس پر کام کا بوجھ نہیں ڈال سکتا۔ اس طرح کا بوجھ ڈالے تو اسے بذات خود یا کسی اور کے ذریعے اس کی مدد لازماً کرنی ہوگی۔[۳]

---

[۱] بخاری، کتاب العتق، باب قول النبی صلی اللّٰه علیه وسلم العبید اخوانکم مسلم کتاب الأیمان، باب صحبة الممالیک.

[۲] مسلم، کتاب الایمان، باب اطعام المملوک مما یاکل.

[۳] نووی، شرح مسلم: جلد۶، جز: ۱۱، ص: ۱۱۱.

حدیث میں ہے کہ غلام کے ساتھ ناروا زیادتی ہوتو اسے آزاد کردیا جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنے غلام کو مارا تو اس کی پیٹھ پر اس کا نشان پڑ گیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے دیکھا تو کہا میں نے غالباً تمھیں تکلیف پہنچائی ہے؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا۔ جاؤ تم آزاد ہو۔ پھر زمین سے کوئی تنکا اٹھایا اور کہا اس کے برابر بھی اس کا اجر نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من لطم مملوكا او ضربه فكفارته ان يعتقه[۱] — جو اپنے غلام کے منہ پر تھپڑ مارے یا کسی اور جگہ مارے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کردے۔

سوید بن مقرنؓ کہتے ہیں۔ ہماری ایک لونڈی تھی جسے ہمارے ایک آدمی نے غصے میں تھپڑ مار دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا اسے آزاد کردو، لوگوں نے عرض کیا ہمارے پاس دوسری خدمت گار نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا جب اس کی ضرورت نہ رہے (یا کوئی دوسرا انتظام ہوجائے) تو اسے آزاد کردو۔[۲]

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا۔ پیچھے سے کسی کی آواز سنی۔ ابو مسعود! خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی کہ تمھیں اس پر حاصل ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ موجود تھے، میں نے کوڑا زمین پر ڈال دیا اور کہا کہ اس کے بعد کسی غلام کو کبھی نہیں ماروں گا اور یہ غلام آج سے آزاد ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم اسے آزاد نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمھیں چھو جاتی۔[۳]

حدیث میں غلام پر جھوٹا الزام لگانے اور اسے بدنام کرنے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ مسلم، كتاب الأيمان، باب صحبة المماليك وكفارة من لطم عبده۔ مسند أحمد: ۲/ ۶۱.

۲۔ مسلم، كتاب الأيمان، باب صحبة المماليك و كفارة من لطم عبده.

۳۔ مسلم، كتاب الأيمان، باب صحبة المماليك وكفارة من لطم عبده۔ ابو داؤد كتاب الادب.

من قذف مملوکه وهو بریٔ مما قال جلد یوم القیامة الا أن یکون کما قال[1]	جو اپنے غلام پر (زنا کی) تہمت لگائے اور جو بات کہی گئی ہے وہ اس سے بری ہے (بے گناہ ہے) تو قیامت کے روز اسے کوڑے لگائے جائیں گے الا یہ کہ وہ ویسا ہی ہو جیسا کہ کہا گیا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ غلام پر تہمت لگانے سے حد قذف تو جاری نہیں ہوگی، البتہ اس کی تعزیر (جو حکومت طے کرے) ہوگی[2]

غلامی کے مسئلے کا تعلق جنگی قیدیوں سے ہے۔ موجودہ دور میں ہوسکتا ہے کہ یہ مسئلہ نہ اٹھے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اسلام نے غلامی کو بالکل ختم کر دیا یا اسے سیاسی حالات پر چھوڑ دیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی، مکاتبت کا طریقہ رائج کیا (النور:۳۳)، جس میں غلام اور اس کے مالک کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ غلام متعین رقم ادا کر کے آزادی حاصل کرلے گا۔ آدمی کو یہ حق بھی ہے کہ اپنی زندگی کے بعد غلام کو آزاد قرار دے دے۔ بعض گناہوں اور غلطیوں کے کفارے میں یہ بھی شامل کیا گیا کہ غلام کو آزاد کیا جائے۔ جیسے غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کرنا (النساء:۹۲) قسم توڑنا (المائدۃ:۸۹) یا بیوی کو ماں قرار دے کر اس سے رجوع کرنا (المجادلہ:۳) ان سب تدبیروں کے باوجود اگر غلام ہو تو اسلام نے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی، اس پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنے سے منع کیا، اس کے حقوق متعین کیے اور اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کی۔

مذکورہ بالا احادیث کا تعلق اصلاً غلاموں سے ہے، لیکن ان کی روشنی میں ملازموں، مزدوروں اور ماتحت طبقات کے سلسلے میں حسبِ ذیل اصول وضع کیے جاسکتے ہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الحدود، باب قذف العبید، مسلم، کتاب الأیمان، باب من قذف مملوکه بالزنا

[2] نوویؒ، شرح مسلم: جلد ٦، جزء ۱۱، ص ۱۱۹

[3] نووی، شرح مسلم: جلد٦، جز ۱۱، ص ۱۱۱

۱- ملازم کی تنخواہ اتنی ضرور ہو جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں۔
۲- مالک کو یہ حق نہیں ہے کہ ملازم کو زد و کوب کرے یا اسے جسمانی سزا دے۔ اگر اس سے یہ غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر تاوان لگایا جائے گا۔
۳- مالک کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ ملازم پر جھوٹے الزامات لگا کر اسے بدنام کرے یا اس کی ملازمت ختم کردے۔

محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق

قرآن مجید نے بار بار مسکینوں اور محتاجوں کی مدد پر ابھارا ہے اور ان سے بے توجہی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی سے منع کیا ہے (مثلاً ملاحظہ ہو: البلد:۱۶)۔ وہ جب حسنِ سلوک کا ذکر کرتا ہے تو والدین اور قرابت داروں کے ساتھ بالعموم مسکینوں کا بھی ذکر کرتا ہے (النساء:۳۶، اسراء:۲۶)۔ ایک جگہ فرمایا: وراثت کا مال تقسیم ہو تو جن رشتہ داروں کا حصہ نہیں ہے، ان کا اور یتیموں اور مسکینوں کا خیال رکھا جائے (النساء:۸) جو لوگ مسکینوں اور محتاجوں کی بھوک پیاس اور فقر و فاقہ کا خیال نہیں کرتے اور ان کے ساتھ تعاون اور ہم دردی کا رویہ نہیں اختیار کرتے اس نے ان کی سخت مذمت کی ہے اور انھیں جہنم کی وعید سنائی ہے (الحاقہ:۳۴، الفجر:۱۴، الماعون:۳)۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے محتاجوں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من اغاث ملهوفا كتب الله له ثلثا و سبعين مغفرة واحدة منها صلاح امره كله وثنتان و سبعون له درجات يوم القيامة[1]

جو شخص کسی مصیبت زدہ کی فریاد رسی کرے اللہ تعالیٰ اس کے نامۂ اعمال میں تہتر مغفرتیں لکھے گا۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس کے سارے کام درست ہوجائیں گے باقی بہتر قیامت کے دن اس کے درجات میں اضافہ کا سبب ہوں گے۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الشفقة والرحمة على الخلق بحواله بيهقى

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے اپنی سنگ دلی کی شکایت کی اور علاج پوچھا تو آپ نے فرمایا:

اطعم المسکین وامسح رأس الیتیم[۱]	مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ (سنگ دلی جاتی رہے گی)

حدیث میں غریبوں اور مسکینوں سے محبت کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس لیے کہ محبت کے بغیر خدمت نہیں ہوسکتی۔ جو شخص ان سے محبت کرے وہی ان کے ساتھ حسنِ سلوک بھی کرسکتا ہے۔ حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں:

امرنی خلیلی صلی اللہ علیہ وسلم بسبع امرنی بحب المساکین والدنو منھم[۲]	میرے محبوب رسول اللہ ﷺ نے مجھے سات باتوں کی ہدایت فرمائی۔ (ان میں سے ایک یہ تھی کہ) آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں مسکینوں سے محبت کروں اور ان کی قربت اختیار کروں۔

رسول اللہ ﷺ کو خود بھی مسکینوں سے جو محبت اور ہمدردی تھی اور جو تعلق خاطر ان سے آپ محسوس فرماتے تھے، اس کا اظہار آپ کی ایک دعا سے ہوتا ہے۔ آپ نے دعا فرمائی۔

اللّٰھم احیینی مسکینا و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین.	اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکینی ہی کی حالت میں موت دے اور مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔

حضرت عائشہؓ نے اس دعا کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ مساکین، دولت مندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں پہنچیں گے۔ پھر آپ نے نصیحت فرمائی:

یا عائشۃ احبی المساکین و قربیھم فان اللہ یقربک یوم القیٰمۃ[۳]	اے عائشہ! مسکینوں سے محبت کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو۔ اللہ تمھیں قیامت کے روز اپنے سے قریب کرے گا۔

---

۱ مسند احمد: ۱۳۹/۶ ۲ مسند احمد: ۱۵۹/۵

۳ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء بحوالہ ترمذی و بیھقی

اسلام نے ان اخلاقی تعلیمات کے ساتھ مسکینوں اور محتاجوں کی فلاح و بہبود کی مختلف صورتیں بھی رکھی ہیں۔

۱۔ بعض عبادات میں نقص یا کمی کی تلافی کے لیے فدیہ رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک صورت متعین تعداد میں مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اسی طرح بعض غلطیوں کا کفارہ بھی مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔

۲۔ مالِ غنیمت میں مسکینوں اور محتاجوں کا حصہ رکھا گیا ہے (الانفال:۴۱)

۳۔ مصارفِ زکوٰۃ کی جو مدّات بیان ہوئی ہیں ان میں سب سے پہلی مد فقراء اور مساکین کی ہے۔ (التوبۃ:۶۰)

ناداروں اور مسکینوں کو معاشی لحاظ سے اوپر اٹھانے کے لیے جائز حدود میں فرد جو کوشش کرے اور ریاست جو اقدامات کرے وہ سب اسلامی تعلیم اور اس کی روح کے عین مطابق ہوں گے۔

ضعیفوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق

جو شخص جسمانی طور پر کم زور ہوتا ہے وہ معاشی دوڑ دھوپ میں بالعموم پیچھے رہ جاتا ہے اور دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص خوشی سے اس کی خدمت نہیں کرتا بلکہ اسے ایک طرح کا بوجھ سمجھتا ہے۔ احادیث میں اس ذہن کی اصلاح کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تمھیں یہاں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی کم زوروں اور لاچاروں کے طفیل میں ملتا ہے۔ اس لیے ان پر احسان مت جتاؤ بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ان کی خدمت کی توفیق بخشی۔ اللہ تعالیٰ اصلاً ان کم زوروں کو رزق پہنچانا چاہتا ہے لیکن اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت اس نے تمھیں اس کا واسطہ بنایا ہے۔ اگر تم نے اس میں غفلت اور کوتاہی کی تو درمیان سے تمھارا واسطہ ختم ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ دوسروں سے یہ خدمت لے گا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سخاوت اور شجاعت میں بہت مشہور تھے۔

ان کے صاحبزادے مصعب بن سعدؓ کہتے ہیں کہ انھیں یہ احساس ہوا کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ ان سے بہتر ہیں (غالبًا ان کو یہ خیال بھی ہوا کہ ان کی خدمات کی وجہ سے مال غنیمت میں ان کا حق دوسروں سے زیادہ ہے) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

هل ترزقون و تنصرون الا بضعفائكم[1]	تمھیں تمھارے ضعیفوں ہی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔

یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے:

انما ینصر اللّٰه هٰـذه الامـة بضعیفها بدعوتهم و صلوٰتهم و اخلاصهم[2]	اللہ تعالیٰ اس امت کی مدد تو اس کے ضعیفوں کی بنا پر کرتا ہے۔ ان کی دعا، ان کی نماز اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ افراد ہی کو نہیں پوری امت کو بھی اگر غلبہ اور کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کے جواں مردوں اور بہادروں کو نہ تو اترانا چاہیے کہ ان کے ذریعے یہ کارنامہ انجام پایا اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ معاشرے کے کم زوروں اور ناتوانوں کے مقابلے میں وہ اونچی حیثیت کے مالک ہیں، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کم زوروں کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت اونچا ہے اور ان ہی کی آہ و زاری اور دعاؤں سے ان کو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

ابغونی الضعفاء فانما ترزقون و تنصرون بضعفائكم[3]	ضعیفوں کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ اس لیے کہ تمھیں اپنے ضعیفوں ہی کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے اور مدد کی جاتی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الجهاد، باب من استعان علی الضعفاء

[2] نسائی، کتاب الجهاد، باب الاستنصار بالضعیف

[3] ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی الانتصار بزذل الخیل والضعفة۔ نسائی، کتاب الجهاد، باب الاستنصار بالضعیف.

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ابغونی فی ضعفائکم فانما ترزقون و تنصرون بضعفائکم[1]	مجھے اپنے ضعیفوں میں تلاش کرو۔ اس لیے کہ ضعیفوں کی وجہ سے تمھیں رزق بھی دیا جاتا ہے اور مدد بھی کی جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ ضعیفوں کو تلاش کرو تا کہ ان کا حق ادا کیا جائے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان کو کھلا پلا رہے ہو بلکہ یہ سمجھو کہ تمھیں جو کچھ بھی ملتا ہے ان ہی کی وجہ سے ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی ہر وقت ضعیفوں کی خبر گیری فرماتے رہتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ میں تمھیں ضعیفوں اور لاچاروں ہی میں مل سکتا ہوں، مجھے ڈھونڈنا ہو تو انھیں کے درمیان ڈھونڈو۔ امیروں اور رئیسوں اور خوش حال لوگوں کے درمیان تم مجھے نہیں پاؤ گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قسم کا ذہن پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا ہو جائے تو انسان کم زوروں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کو بخشش اور احسان نہیں سمجھے گا۔ بلکہ اپنا ایک فرض تصور کرے گا۔ ان کا حق ادا کرنے کے باوجود اسے ہمیشہ اپنی کوتاہی کا احساس دامن گیر رہے گا۔

قرآن مجید نے اہل ایمان کا ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا ہے کہ انسان کے مال میں سائل اور محروم کا حصہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾ (الذاریٰت:۱۹)	ان کے مالوں میں حق ہوتا ہے سائل اور محروم کا۔

دوسری جگہ فرمایا کہ ان کے مال میں سائل اور محروم کا متعین حق ہوتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ (المعارج:۲۴،۲۵)	اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا متعین حق ہوتا ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب فضائل الجهاد، باب ماجاء فی الاستفتاح بصعاليک المسلمين

سائل سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت بیان کرتا اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جو وسائل حیات سے محروم ہونے کے باوجود دست سوال دراز نہیں کرتا۔ سائل اور محروم میں بوڑھے، بیمار، اپاہج، معذور، لاوارث بچے اور اس طرح کے سب ہی لوگ آجاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہوں گے جو اپنی ضروریات بیان کریں گے اور مدد کے طالب ہوں گے، اور وہ بھی ہوں گے جو اپنی غربت اور افلاس کا ذکر کرنا اور مدد طلب کرنا پسند نہ کریں گے۔ ایک مومن کے مال میں ان سب کا لازماً حصہ ہونا چاہیے اور ان کی احتیاج اور محرومی کو ختم کرنا حکومت کی بھی ذمہ داری ہے۔[۱]

---

[۱] کم زور افراد اور طبقات کے حقوق کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق

- صبر کی تلقین
- ذمہ داریوں میں تخفیف
- صلاحیتوں کا اعتراف
- معذور دُہرے اجر کا مستحق ہے
- معاشرے کی ذمہ داری
- زت کا مقام دیا جائے
- حسن سلوک کیا جائے
- دل جوئی کی جائے
- بدسلوکی نہ کی جائے
- پاگل غیر مکلّف ہے
- کم زور عقل والوں کی رعایت
- معذور کی کفالت

معذور کے اخلاقی اور قانونی حقوق[1]

اللہ تعالیٰ کا اس شخص پر بڑا احسان ہے جسے اس نے صحیح سالم اور تندرست و توانا پیدا کیا۔ دل، دماغ، آنکھ، کان، ناک اور ہاتھ پیر عطا کیے۔ اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو ان میں سے کسی نہ کسی نعمت سے محروم ہیں۔ اسلام نے ان کے اندر ہمت و حوصلہ پیدا کیا اور احکام شریعت میں ان کی رعایت کی۔ اس کے ساتھ اس نے ان کی خدمت، دل جوئی اور ہمدردی کو ہر اس شخص کا دینی اور اخلاقی فرض قرار دیا جو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جسمانی اور دماغی نعمتوں سے بہرہ یاب ہے۔

صبر کی تلقین

اسلام نے سب سے پہلے خود معذور (Handicap) کو صبر کی تلقین کی ہے۔ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے۔ تمھارا امتحان تمھاری معذوری میں ہے۔ صبر کرو گے تو اجر پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو خوش دلی سے قبول کرنا انسان کو اس کے انعام و اکرام کا حق دار بناتا ہے۔ جزع فزع یا شکوہ و شکایت بے سود ہے۔ اس سے کسی نقصان کی تلافی نہیں ہوتی، البتہ انسان صبر کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔

---

[1] کم زور افراد اور طبقات کے ذیل میں معذور (Handicap) بھی آتے ہیں۔ اسلام نے ان کے سلسلے میں کافی تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ یہاں الگ سے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے فرمایا کہ وہ فرماتا ہے:

اذا ابتلیتُ عبدی بحبیبتیه فصبر عوّضته منهما الجنة یرید عینیه[1]

جب میں اپنے بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں کے ذریعے آزمائش میں ڈالوں اور وہ صبر کرے تو میں ان کے عوض اسے جنت عطا کروں گا۔ دو محبوب چیزوں سے آپ آنکھیں مراد لے رہے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے اسی مفہوم کی روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

من اذهبتُ حبیبتیه فصبر و احتسب لم ارض له ثوابا الا الجنة[2]

جس شخص کی میں نے دو محبوب چیزیں (آنکھیں) لے لیں۔ اس نے اس پر صبر کیا اور اجر و ثواب طلب کرتا رہا تو جنت کے علاوہ کوئی اور صلہ میں اس کے لیے پسند نہیں کروں گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت کو مرگی کی شکایت تھی، جب اس پر اس کا دورہ پڑتا تو اسے اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ تم چاہو تو میں دعا کروں (امید ہے اللہ تعالیٰ شفا دے گا) چاہو تو صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کے عوض جنت عطا فرمائے گا۔ اس نے کہا تب تو صبر ہی کروں گی۔ البتہ آپ دعا فرمایئے کہ دورہ کی حالت میں میری بے ستری نہ ہو۔ آپ نے اس کی دعا فرمائی۔[3]

اس عورت نے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے اس کی درخواست رد تو نہیں کی

---

[1] بخاری، کتاب المرضیٰ، باب فضل من ذهب بصره

[2] ترمذی، ابواب الزهد، باب ماجاء فی ذهاب البصر

[3] بخاری، کتاب المرضیٰ، باب فضل من یصرع من الریح۔ مسلم، کتاب البر والصلة، باب ثواب المومن فیما یصیبه

لیکن صبر کی فضیلت بیان کی اور اس کی تلقین فرمائی۔ ہوسکتا ہے اسی کو آپ نے اس کے حق میں بہتر سمجھا ہو، لیکن اس کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس میں دعا کی ممانعت نہیں ہے۔ ایک معذور اس بات کی دعا کر بھی سکتا ہے اور کرا بھی سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معذوری سے نجات دے، بلکہ اسے عافیت کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ البتہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں تازہ رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی اور اسے وہ اس کے حق میں مفید سمجھے گا تو دعا قبول ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔ اسے ہر حال میں اللہ کے فیصلہ پر راضی اور مطمئن ہونا چاہیے اور کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ احادیث میں صبر کی تلقین کے ساتھ دعا کا بھی ثبوت ہے۔

حضرت عثمان بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی، دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ بینائی عطا کرے اور عافیت دے۔ آپ نے فرمایا کہ تم چاہو تو میں دعا کر سکتا ہوں لیکن صبر کرو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔ لیکن اس نے دوبارہ دعا ہی کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا تم اچھی طرح وضو کر کے یہ دعا کرو:

اللّٰھم انی اسألک و اتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ انی توجھت بک الی ربی لیقضی لی فی حاجتی اللّٰھم فشفعہ فیّ[1]	اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے نبی محمدؐ کے واسطہ سے جو نبی رحمت ہیں متوجہ ہوتا ہوں، میں نے آپ کے ذریعے اپنے رب کی طرف رجوع کیا ہے تا کہ وہ میری حاجت پوری کرے۔ اے اللہ میرے سلسلہ میں ان کی شفاعت قبول فرما۔

معذور کو اپنی محرومی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس پر مایوسی طاری رہتی ہے اور وہ حالات کے مقابلہ کی اپنے اندر تاب نہیں پاتا۔ اس وجہ سے صبر کی اس کے لیے بڑی اہمیت ہے۔ اس سے اسے تسلی و تشفی اور ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے کہ آج گو وہ ایک نعمت سے محروم ہے، لیکن کل اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بہترین صلہ اسے ملنے والا ہے۔

---

[1] ترمذی، کتاب الدعوات، باب فی انتظار الفرج وغیر ذلک

صبر اسے جزع فزع اور شکوہ شکایت سے روکتا ہے۔ ایک مومن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ راضی بہ رضائے الٰہی رہتا ہے۔ یہ خوبی زندگی کے ہر نازک مرحلہ میں کام آتی اور اسے ثابت قدم رکھتی ہے۔ صبر یہ نہیں ہے کہ آدمی بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا رہے، بلکہ صبر استقامت اور پامردی کا نام ہے۔ صبر کا وصف ایک معذور شخص کے اندر بھی یہ حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ نہ جائے بلکہ حالات کا مقابلہ کرے اور کش مکشِ حیات میں اپنا حصہ ادا کرے۔

ذمہ داریوں میں تخفیف

معذور کو یہ احساس پریشان کرسکتا ہے اور کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت اس طرح نہیں کر پارہا ہے جس طرح دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ اسلام نے اسے اطمینان دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک پر اس کی طاقت کے لحاظ سے بوجھ ڈالا ہے۔ اس پر ان بہت سے کاموں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو صحیح سالم اور تندرست انسانوں پر عائد ہوتی ہے۔ جہاد کی اسلام میں بڑی فضیلت ہے۔ بعض اوقات اسلامی ریاست اسے اپنے ہر شہری پر فرض بھی قرار دے سکتی ہے۔ اس صورت میں کسی کا اس سے پیچھے رہ جانا بہت بڑا گناہ ہے۔ لیکن معذور بہرحال اس سے مستثنٰی ہوں گے۔ چناں چہ احکامِ جہاد کے ذیل میں ارشاد ہوا:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ؑ (الفتح:۱۷)

نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے، نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے (اگر وہ جہاد میں شرکت نہ کریں) اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے جنتوں میں داخل فرمائے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو شخص روگردانی کرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔

ایک جگہ قرآن نے کہا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور جہاد نہ کرنے

والے ایک نہیں ہوسکتے۔ جہاد کرنے والوں کے بڑے درجات ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس کلیہ سے معذور مستثنیٰ ہیں۔ ارشاد ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ (النساء:۹۵،۹۶)

ایمان والوں میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر جہاد سے بیٹھ رہیں اور وہ جو اللہ کے راستے میں اپنے جان و مال سے جہاد کریں، برابر نہیں ہیں۔ اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بیٹھ رہنے والوں کے مقابلہ میں بڑا اونچا درجہ عطا کیا ہے۔ گو ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اس نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں کے مقابلہ میں اجر عظیم سے نوازا ہے۔ یعنی اس کی طرف سے بڑے درجات اور مغفرت و رحمت ہے، اور اللہ غفور رحیم ہے۔

ان آیتوں میں معذوروں کو الگ کر کے غیر معذور اور صحت مند افراد کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر کسی کے اندر خلوص کے ساتھ راہِ خدا میں جان و مال لٹانے کا جذبہ ہے اور وہ محض اپنی مجبوری اور معذوری کی وجہ سے اس میں حصہ نہیں لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی مجاہدین کا ثواب عطا فرمائے گا۔ احادیث میں یہ بات کھول دی گئی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک غزوہ میں فرمایا:

ان اقواما خلفنا ما سلكنا شعبا و لا واديا الا وهم معنا حبسهم العذر[۱]

بے شک ہمارے پیچھے کچھ لوگ رہ گئے ہیں ہم جس گھاٹی اور وادی میں بھی چلیں وہ اپنی نیت اور ارادہ کی وجہ سے ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کو معذوری نے روک رکھا ہے۔

---

[۱] بخاری، کتاب الجهاد، باب من حبسه العذر من الغزو

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

لقد ترکتم بالمدينة اقواما ما سرتم مسيرا ولا انفقتم من نفقة ولا قطعتم من واد الا وهم معكم فيه قالوا وكيف يكونون معنا وهم بالمدينة قال حبسهم العذر[1]	تم نے مدینہ میں کچھ لوگوں کو چھوڑا ہے کہ تم تھوڑا یا بہت جو چلتے ہو یا خرچ کرتے ہو یا کوئی وادی طے کرتے ہو، وہ تمھارے ہی ساتھ ہوتے ہیں۔ صحابہ نے کہا کہ وہ مدینہ میں رہتے ہوئے ہمارے ساتھ کیسے ہوسکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کو ارادہ کے باوجود عذر نے روک رکھا ہے۔

بیماری اور سفر کی سہولت کا نہ ہونا بھی عذر ہے لیکن اس میں جسمانی معذوری بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔ اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں اسی کا ذکر ہے۔ یہ حدیثیں اپنے عام الفاظ میں اس کی تائید کرتی ہیں۔

نماز باجماعت کی بڑی فضیلت ہے۔ اسے سنت موکدہ بلکہ واجب کہا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے جہاد سے متعلق آیات سے یہ استدلال کیا ہے کہ معذور کے لیے جماعت کی شرکت ضروری نہیں ہے۔ ایک حدیث میں اس کی صراحت بھی موجود ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من سمع النداء فلم يات الصلوٰة فلا صلوٰة الا من عذر[2]	جو اذان سنے اور جماعت میں شرکت کے لیے نہ آئے تو اس کی نماز نہ ہوگی الاّ یہ کہ اسے کوئی عذر ہو اور اس وجہ سے وہ نہ پہنچے۔

یہاں دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں شریعت نے معذوروں کو احکام شریعت سے یا تو مستثنیٰ قرار دیا ہے یا ان کے ساتھ رعایت اور تخفیف کی ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی القعود من العذر

[2] رواه ابن ماجه والدار قطنی وابن حبان والحاكم

صلاحیتوں کا اعتراف

بعض افراد کسی نہ کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہونے کے باوجود بہت سی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر ان کی ہمت افزائی ہو اور ان کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ باعزت زندگی گزار سکتے ہیں اور معاشرے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ اسلام کسی بھی معذور کے اندر موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی معذوری کے باوجود وہ کوئی خدمت انجام دے تو اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ موجودہ دور میں دینی خدمات بڑی حد تک اپنی قدر و قیمت کھو چکی ہیں۔ اس لیے اذان اور امامت جیسے کاموں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان مناصب کے لیے معاشی اور معاشرتی لحاظ سے فروتر افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے، حالاں کہ اسلام کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے لیے ذی صلاحیت اور اصحابِ تقویٰ کے انتخاب کا حکم ہے۔ دورِ اول میں اسی پر عمل تھا۔ اس پس منظر میں یہ دیکھیے کہ عہدِ رسالت میں امامت اور مؤذنی کے فرائض کون انجام دے رہا ہے۔ جب تک آپ بقید حیات تھے خود ہی امامت فرماتے تھے۔ البتہ دو مؤذن آپ نے مقرر فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت بلالؓ اور دوسرے عمرو بن ام مکتومؓ تھے۔[1]

حضرت بلالؓ آزاد کردہ غلام اور حضرت عمرو بن ام مکتومؓ نابینا تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام غلاموں اور معذوروں کو کیا مقام دیتا ہے اور ان کی اس نے کس قدر عزت افزائی کی ہے؟ اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ تبوک کے لیے روانہ ہوئے تو عمرو بن ام مکتومؓ کو امامت کے لیے اپنا نائب اور جانشین مقرر فرمایا۔[2]

یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ مکہ سے ہجرت کرکے

---

۱ مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب جواز اذان الاعمیٰ

۲ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ الاعمیٰ

سب سے پہلے مصعب بن عمیرؓ ہمارے پاس مدینہ پہنچے۔ ان کے بعد عمرو ابن ام مکتومؓ آئے۔ رسول اللہ ﷺ بیشتر غزوات میں انھیں اپنا نائب مقرر فرماتے تھے اور وہ مدینہ میں امامت کیا کرتے تھے۔[1]

علامہ ابن عبد البر واقدی کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں تیرہ غزوات میں مدینہ منورہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔[2]

عتبان بن مالک انصاریؓ ان صحابہ میں ہیں جو جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی خراب ہوگئی تھی لیکن اپنے قبیلہ کی امامت وہی فرماتے تھے۔[3]

عمیر بن عدی بن خرشہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ نابینا تھے لیکن اپنے قبیلہ میں سب سے پہلے اسلام لائے، قرآن شریف بھی تھوڑا سا حفظ تھا اس وجہ سے قاری کہلاتے تھے۔ اپنے قبیلہ کی امامت وہی فرماتے تھے۔[4]

معذور دوہرے اجر کا مستحق ہے

اسلام کا تصور یہ ہے کہ معذور اپنی معذوری کے باوجود کوئی دینی کام انجام دیتا ہے تو اس کا اجر وثواب بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اسے زیادہ محنت ومشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتی ہیں:

---

[1] ابن حجر، الاصابة فی تمییز الصحابة: ۴/ ۴۹۵

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۳/ ۲۷۶

[3] بخاری، کتاب الحکمة باب المساجد فی البیوت۔ مسلم، کتاب المساجد، باب الرخصة عن التخلف عن الجماعة

[4] الاصابة: ۴/ ۵۹۹۔ الاستیعاب: ۳/ ۲۹۱

الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة والذی يقرء القرآن و يتتعتع فيه وهو عليه شاق له اجران[1]	قرآن میں مہارت رکھنے والا ان (فرشتوں) کے ساتھ ہوگا جو اللہ کی کتابوں کے لکھنے والے اور بہت ہی نیک ہیں، جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں رکاوٹ محسوس کرتا ہے اس وجہ سے قرآن کا سیکھنا اور پڑھنا اس پر دشوار ہے تو اس کو دوگنا اجر ملے گا۔

اس حدیث میں ایک طرف تو قرآن کے ماہر کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ اسے ان بزرگ و برتر ملائکہ کی معیت نصیب ہوگی، جو حامل قرآن ہیں اور جن کے ہاتھوں میں یہ پاک صحیفہ ہے۔ دوسری طرف اس شخص کی ہمت افزائی کی گئی ہے جسے اس طرح کی مہارت حاصل نہیں ہے اور جو زبان میں لکنت کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس کی صلاحیت ہی کم ہے، قرآن روانی سے نہیں پڑھ پاتا لیکن اس کے باوجود اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور محنت و مشقت سے قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کا اجر عام قاری کے مقابلے میں دوگنا ہوگا۔ تلاوت قرآن کے بارے میں یہاں جو بات کہی گئی ہے اسی پر ان تمام عبادات اور دینی کاموں کو قیاس کیا جاسکتا ہے، جنھیں ایک معذور زحمت کے باوجود انجام دیتا ہے۔

اس طرح اسلام نے بیماروں اور معذوروں کے اندر ایک نئی طاقت اور توانائی پیدا کردی اور انھوں نے بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ دینی خدمات انجام دیں۔

نماز باجماعت کے سلسلے میں صحابہ کرام کے ذوق وشوق اور جذبے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ان كان المريض ليمشى بين رجلين حتى ياتى الصلوٰة[2]	بے شک مریض (بھی) دو آدمیوں کے درمیان (سہارے سے) چل کر نماز میں پہنچتا تھا۔

---

[1] مسلم، کتاب فضائل القرآن۔ باب فضیلة حافظ القرآن و رواه البخاری بمعناه

[2] مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلوٰة الجماعة الخ

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

لقد کان الرجل یوتیٰ بھا یھادی بین الرجلین حتی یقام فی الصف[1]	آدمی کو دو آدمیوں کے بیچ میں (سہارا دے کر) لایا جاتا اور صف میں کھڑا کیا جاتا۔

عمرو ابن ام مکتومؓ کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ بینائی نہ ہونے کے باوجود وہ جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ اسی جنگ میں شہادت پائی۔[2]

معاشرے کی ذمہ داری

اسلام نے جہاں معذوروں کے اندر خود اعتمادی، عزم و ہمت اور استقامت پیدا کی وہیں معاشرے کو بھی ان کے سلسلے کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور کہا کہ ان ذمہ داریوں کو ادا کر کے تم اپنا فرض انجام دیتے ہو کسی پر احسان نہیں کرتے ہو۔

عزت کا مقام دیا جائے

عام طور پر معذوروں کو سوسائٹی میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انھیں فروتر نہ سمجھا جائے اور عزت کی جگہ دی جائے۔ چناں چہ مکہ کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ بعض سردارانِ قریش سے اسلام پر بات چیت فرما رہے تھے کہ اسی اثنا میں عمرو ابن ام مکتومؓ پہنچ گئے۔ ان کی اچانک آمد آپ کو اس خیال سے ناگوار گزری کہ یہ متکبرین عرب ایک نابینا کے ساتھ کسی مجلس میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح ان کو اللہ کا پیغام سنائیں، اس لیے کہ اگر ان کے دل اس کے لیے کھل گئے اور انھوں نے اسے قبول کرلیا تو دوسروں کو بھی ترغیب ہوگی اور وہ بھی اس کی طرف آگے بڑھیں گے۔ قرآن مجید نے ان سرکشوں کے پیچھے اس طرح پڑنے سے منع کیا اور کہا کہ حق کو قبول کرنے میں ان ہی کا فائدہ ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ الخ

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب: ۲۷۶/۳

اگر نہیں قبول کرتے ہیں تو تمھارا کوئی نقصان نہیں، سراسر ان ہی کا نقصان ہے۔ ان سرکشوں کی خاطر اللہ کے ان بندوں کی طرف تمھاری توجہ کم نہ ہو، جن کے دل اس کے خوف سے معمور ہیں:

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓی ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ﴿۲﴾ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰٓی ﴿۳﴾ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ﴿۸﴾ وَ هُوَ یَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ﴿۱۰﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ (عبس:۱-۱۲)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا اس پر کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا اور تمھیں کیا معلوم کہ شاید وہ تزکیہ چاہتا ہو۔ یا نصیحت حاصل کرنا چاہتا ہو اور نصیحت اس کے لیے مفید ہو، لیکن جو بے پروائی کرتا ہے تم اس کے پیچھے پڑے ہو۔ اگر وہ تزکیہ نہ حاصل کرے تو تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ لیکن جو تمھارے پاس دوڑ کر آرہا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے تو تم اس سے غفلت برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

اس طرح اسلام نے یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار ظاہری وجاہت، صحت و تندرستی اور دولت و ثروت نہیں ہے بلکہ تقویٰ و طہارت اور اخلاق و کردار ہے۔ وہ اندھا شخص جس کے اندر حق کی طلب ہے اور جو اپنی اصلاح اور تزکیہ چاہتا ہے وہ ان خوب صورت آنکھوں والوں سے ارفع و اعلیٰ ہے جن کے دل پتھر بن چکے ہیں اور جو اپنی دولت و سطوت کے غرور میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے اپنے کو بے نیاز سمجھ رہے ہیں۔ ان سرکشوں اور جباروں کی خاطر اللہ کے ان معذور بندوں سے بے رخی برتنا صحیح نہیں ہے۔

معذور کے اندر بالعموم احساس کم تری بھی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے ملنے جلنے کھانے پینے اور معاشرتی تعلق رکھنے میں تکلف برتتا ہے۔ اسلام نے اس احساس کم تری کو دور کیا ہے۔ اس لیے کہ جب تک یہ احساس باقی ہے وہ اپنے آپ کو فروتر ہی سمجھے گا

اور تندرست اور صحت مند لوگوں کی صف میں بیٹھنے سے احتراز کرے گا۔ چناں چہ ایک جگہ معاشرتی احکام کے ذیل میں فرمایا:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ (النور:٦١)

نہ تو اندھے کے لیے کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے کے لیے حرج ہے اور نہ مریض کے لیے کوئی حرج ہے اور نہ خود تمھارے لیے حرج ہے کہ تم اپنے گھروں سے کھاؤ۔

مطلب یہ کہ معذوروں اور مریضوں کو عزیزوں، رشتہ داروں اور دوست احباب کے ہاں آنے جانے اور کھانے پینے کی پوری اجازت ہے۔ جب اسلام نے اس پر پابندی نہیں لگائی ہے تو وہ بھی کسی قسم کی پابندی نہ محسوس کریں۔ وہ معاشرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ ہیں اور سب سے برابر کے تعلقات رکھ سکتے ہیں۔

بعض لوگ مریضوں اور معذوروں کے ساتھ ملنے جلنے اور کھانے پینے میں انقباض اور کراہت محسوس کرتے ہیں۔ اس میں ان پر بھی تنقید ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی آمد و رفت کسی کے لیے بارِ خاطر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے اور تمھارا فرض ہے کہ ان کی خدمت کرو نہ یہ کہ ان سے نفرت کرو اور دور بھاگو۔

حسنِ سلوک کیا جائے

اسلام نے معاشرے کو معذوروں، کم زوروں اور مجبوروں کی مدد اور تعاون پر ابھارا ہے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ ان کی مدد کی بہت سی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک مالی مدد بھی ہے۔ مالی مدد کی اہمیت بالعموم محسوس بھی کی جاتی ہے اور اسی کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے لیکن مدد کی دوسری شکلیں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام نے مالی اور غیر مالی ہر طرح کی مدد کی ترغیب دی ہے۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے بندوں پر جس طرح مال خرچ کرنا صدقہ ہے اسی طرح اپنی صلاحیت اور توانائی کا صرف کرنا بھی صدقہ ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر و

فکر، تسبیح وتہلیل اور عبادت ہی سے نہیں بلکہ اپنے اخلاق و کردار، خدمت خلق، کم زوروں اور معذوروں کی غم خواری وخیرخواہی اور معاشرہ میں نیکی اور بھلائی کو عام کرکے اور لوگوں کو بدی اور معصیت سے باز رکھ کر بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توانائی اور قوت وصلاحیت کا حق ادا کرتا ہے۔

حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ تمھارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے۔ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا بھی صدقہ ہے۔ کسی بھٹکنے والے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے۔ کسی اندھے آدمی کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ راستہ سے ہڈی، کانٹا اور پتھر کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے بھائی کے ڈول میں ڈول سے پانی بھر دینا بھی صدقہ ہے۔[1]

اس سے زیادہ تفصیل ایک دوسری روایت میں آئی ہے۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ہر روز جب سورج طلوع ہوتا ہے تو انسان پر اپنے نفس کی طرف سے صدقہ واجب ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارے پاس تو مال نہیں ہے کہ ہر روز صدقہ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا صدقہ کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ان ہی میں سے اللہ اکبر، الحمد للّٰہ، لا الٰہ الا اللّٰہ، استغفر اللّٰہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ معروف کا حکم دو، منکر سے روکو۔ راستے سے کانٹا، ہڈی اور پتھر ہٹادو، کسی اندھے کو راہ دکھادو، گونگے اور بہرے کو بات سمجھا دو۔ کسی حاجت مند کو اس جگہ کی نشان دہی کردو جہاں سے تمھارے خیال میں اس کی مدد ہوسکتی ہے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرو اور کم زور کی مدد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہ سب صدقے کی صورتیں ہیں۔[2]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف

[2] مسند احمد: ۵/ ۱۶۹

من قاد مکفوفا اربعین خطوة غفرله ما تقدم من ذنبه و ما تاخر[1]	جو شخص چالیس قدم کسی نابینا کی رہنمائی کرے تو اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔

دل جوئی کی جائے

معذور کے لیے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ اس کی دل جوئی کی جائے۔ اس کے ساتھ ہمدردی و غم خواری کا اظہار کیا جائے اور اس کے جذبات کا احترام کیا جائے۔ اس سے اس کو تسلی و تشفی اور راحت ملتی ہے اور بے گانگی اور اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں رسول اکرم ﷺ کے حسن خلق اور کردار کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوسکتا ہے۔

اس سے پہلے حضرت عتبان بن مالکؓ کا ذکر آچکا ہے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی ختم ہوگئی تھی، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں بارش کے دنوں میں، مسجد نہیں پہنچ سکتا۔ آپ میرے گھر کسی جگہ نماز ادا فرما دیں تاکہ میں وہیں نماز ادا کیا کروں۔ آپ نے فرمایا۔ بہت اچھا۔ انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے روز دن چڑھنے کے بعد آپ حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ تشریف لائے۔ دریافت فرمایا، کس جگہ چاہتے ہو کہ میں نماز پڑھوں۔ میں نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ ہم نے بھی آپ کے پیچھے نماز ادا کی اور سلام پھیرا۔ پھر ہم نے خزیر (جو گوشت اور آٹے سے بنایا جاتا تھا) کھلانے کے لیے آپ کو (تھوڑی دیر) روک لیا۔[2]

---

[1] علامہ سیوطی نے طبرانی، ابونعیم اور بیہقی وغیرہ کے حوالہ سے اس مضمون کی ایک سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ لیکن ان میں ضعف ہے۔ التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/ ۴۲۳ یہاں الفاظِ حدیث حافظ ابن حجر کے رسالہ 'الخصال المکفرۃ' سے لیے گئے ہیں۔ الرسائل المنیریہ: ۱/ ۲۶۳

[2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المساجد فی البیوت۔ مسلم کتاب المساجد، باب الرخصۃ عن التخلف من الجماعۃ

حضرت جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ محلّہ واقف چلو، تاکہ بصیر سے ملاقات کر آئیں۔ بصیر ایک نابینا شخص تھا۔[1]

ابن السکن کہتے ہیں کہ ان کا نام عمیر بن عدی تھا۔ رسول اللہ ﷺ ان کی ملاقات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔[2]

بدسلوکی نہ کی جائے

ایک طرف اسلام نے معذوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی فضیلت بیان کی اور اس کی ترغیب دی۔ دوسری طرف ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور انھیں پریشان کرنے سے منع فرمایا اور اسے اللہ کی لعنت کا سبب قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لعن اللّٰہ من کمہ الاعمٰی عن السبیل[3]	اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جس نے اندھے کو راستے سے بھٹکایا۔

پاگل غیر مکلّف ہے

جسمانی معذوری سے زیادہ سنگین، تکلیف دہ اور عبرت ناک دماغی معذوری ہے۔ اس کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اس کی انتہائی شکل جنون اور پاگل پن ہے، جس میں انسان ہوش و خرد کھو بیٹھتا ہے اور اسے اپنے عمل اور اس کے نتائج کا شعور باقی نہیں رہتا۔ عقل اور ہوش ہی کی وجہ سے انسان کسی بھی عمل کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے بھی اسے تمام شرعی ذمہ داریوں سے مستثنٰی قرار دیا ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ قال المنذری رواہ البزار باسناد جید (الترغیب و الترھیب: ۳/۲۴۸)
۲۔ الاصابة فی تمییز الصحابة: ۴/۵۹۹
۳۔ مسند احمد: ۱/۳۰۹۔ الادب المفرد: ۲/۳۳۸

ان القلم رفع عن ثلاثة عن المجنون حتی یفیق و عن الصبی حتی یدرک و عن النائم حتی یستیقظ[1]	تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے (ان کی کوئی گرفت نہیں ہوگی) مجنون سے جب تک کہ اس کی عقل بحال نہ ہوجائے۔ بچہ سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔ سونے والے سے جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے۔

پاگل سے متعلق بعض احکام

ہمارے فقہانے مجنون کے سلسلے میں حسب ذیل باتیں لکھی ہیں:

۱- مجنون پر کوئی شرعی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو فرائض و واجبات مقرر کیے ہیں، ان کے ادا نہ کرنے پر اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی۔

۲- اس سے کسی معصیت اور نافرمانی کا صدور ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

۳- مجنون کے تصرفات ناقابل اعتبار ہیں۔ یعنی اگر وہ لین دین کرے، ہبہ کرے یا نکاح، طلاق وغیرہ کے سلسلے میں کوئی اقدام کرے تو یہ اقدام غیر موثر ہوگا۔ اسے نافذ نہیں کیا جائے گا۔

۴- اس سے قابل تعزیر جرم سرزد ہو تو اسے سزا نہیں دی جائے گی۔

۵- البتہ اگر اس کی وجہ سے کسی کا جانی یا مالی نقصان ہو تو اس کا تاوان ادا کیا جائے گا۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق الخ۔ ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا۔ بخاری میں یہ روایت موقوف ہے اور ابوداؤد میں مرفوع آئی ہے۔ ابوداؤد میں اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عائشہؓ سے بھی مروی ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہدایۃ کتاب الحجر: ۳/۳۴۹-۳۵۱ اور دیگر کتب فقہ

اس طرح اسلام نے ایک طرف پاگل کو آخرت کے حساب کتاب سے بری قرار دیا ہے اور دوسری طرف اس کے مفادات کا تحفظ کیا ہے تاکہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو اور کوئی اس کی معذوری سے غلط فائدہ نہ اٹھانے پائے۔

کم زور عقل والوں کی رعایت

بعض لوگ مجنوں اور پاگل تو نہیں ہوتے۔ البتہ شدید دماغی کم زوری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان میں معاملہ فہمی کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ اچھے برے کی تمیز نہیں کر پاتے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی بھی معاملہ میں ان کو دھوکا نہ دیا جائے۔ لین دین میں ان کے ساتھ رعایت کی جائے اور بہتر سے بہتر سلوک کیا جائے۔

ایک انصاری اسی طرح کی دماغی کم زوری میں مبتلا تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کاروبار کیے بغیر رہا نہیں جاتا اور کاروبار کرتا ہوں تو دھوکا کھا جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا جب کسی سے معاملہ کرو تو لاخلابة (ہمارے دین میں دھوکا دہی نہیں ہے) کہہ دیا کرو۔ چناں چہ وہ جب بھی معاملہ کرتے تو لاخلابة کہہ دیا کرتے تھے۔[۱]

یہ حدیث آج کے معاشرے اور اسلامی معاشرے کے فرق کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ آج اگر کسی کی کم زوری اور معذوری کا علم ہو جائے تو اس کے استحصال کی کوشش کی جائے گی لیکن اسلامی معاشرے میں اگر کسی کو اس بات کا علم ہو جاتا کہ فلاں شخص معذور ہے تو اسے محبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا زیادہ مستحق سمجھتا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اسے زیادہ سے زیادہ نفع پہچانے کی کوشش کرتا۔ اس لیے ایک اسلامی معاشرے میں کسی کا 'لاخلابة' کہہ دینا اس بات کو اور زیادہ یقینی بنا دیتا تھا کہ اس کو دھوکا ہرگز نہیں دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ممکنہ رعایت کی جائے گی، جس سادگی

۱؎ بخاری، کتاب البیوع، باب مایکرہ من الخداع۔ مسلم، کتاب البیوع

اور سادہ لوحی پر آج انسان بازار میں لٹ جائے، اسلامی معاشرے میں وہی اسے ہر ضرر سے محفوظ رکھتی تھی۔

معذور کی کفالت

جو شخص اندھا، لولا، لنگڑا، اپاہج یا عقلی طور پر معذور ہونے کی وجہ سے کمانے کے قابل نہ ہو تو اسلامی قانون کی رو سے سب سے پہلے اس کا باپ اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ باپ نہ ہو تو قریبی رشتہ داروں پر اس کے معاش کی ذمہ داری عائد ہوگی۔[1]

قریبی رشتہ دار نہ ہوں یا وہ اس کا معاشی بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہوں تو اسلامی ریاست یہ بوجھ اٹھائے گی اور اس کی کفالت کرے گی۔

اسلامی ریاست اس کا نان نفقہ ہی نہیں دوسری ضروریات بھی پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔ سعید بن یربوعؓ ایک قریشی صحابی تھے۔ ان کی بینائی کسی وجہ سے ختم ہوگئی تو حضرت عمرؓ مزاج پرسی اور عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی کے ساتھ فرمایا کہ آپ نماز باجماعت اور جمعہ ترک نہ کیجیے۔ انھوں نے کہا: مسجد تک پہنچانے والا کوئی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہم اس کا انتظام کردیں گے۔ آپ کے پاس اس وقت غلام تھے تو ایک لڑکا ان کے لیے بھیج دیا۔[2]

جب اسلامی ریاست ایک نابینا کی نماز باجماعت اور جمعہ میں شرکت کا انتظام کرسکتی ہے تو اس کی بنیادی ضرورتوں کو بدرجہ اولیٰ پورا کرے گی۔

---

[1] ملاحظہ ہو: هدایه مع فتح القدیر: ۳/ ۳۴۴

[2] الاصابة فی تمییز الصحابة: ۳/۹۸۔ کنز العمال: ۸/ ۱۹۸

دفاع کا حق

- دفاع میں جان دینا شہادت ہے
- دفاع ایک قانونی حق ہے
- اپنی ذات کا دفاع
- کیا اپنی ذات کا دفاع واجب ہے؟
- مال کا دفاع
- کیا مال کا دفاع واجب ہے؟
- خاندان اور بیوی بچوں کا دفاع
- عفت وعصمت کا دفاع
- کیا عفت وعصمت کا دفاع واجب ہے
- دفاع میں تعارف
- دفاع کرنے والے پر حملہ آور کے نقصان کی ذمہ داری نہیں ہے
- دفاعی اقدام میں الاسہل فالاسہل کا اصول
- کسی بھی اقدام کا فیصلہ حالات کے تحت ہوگا
- دفاعی اقدام کے لیے ثبوت چاہیے
- دفاعی اقدام حملہ کے وقت ہوگا

دفاع کا حق

دنیا کا کوئی بھی فرد کسی دوسرے پر کسی قسم کی دست درازی کرے تو اسے دفاع کا حق ہے۔ اسے نہ تو کوئی معقول شخص غلط کہہ سکتا ہے اور نہ کسی ریاست نے اس کا انکار کیا ہے۔ یہ سب ہی کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حق ہے۔ اس حق سے کسی کو محروم کرنا ظلم کو تقویت پہنچانا ہے۔ جب بھی کسی نے ظلم کے سامنے خود سے گھٹنے ٹیک دیے یا اسے اس پر مجبور کیا گیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ ظالم کے حوصلے بڑھے اور ظلم میں اضافہ ہوا۔ یہ سب کچھ آج بھی ہو رہا ہے۔ اس کا بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے خود مظلوم کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ظلم سہنا اور جور وستم برداشت کرنا اس کا مقدر ہے۔ وہ بعض اوقات یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا کہ ظلم و زیادتی کا جواب دینے کا بھی اسے حق حاصل ہے۔ وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو بے بس اور مجبور سمجھنے لگتا ہے جتنا فی الواقع بے بس اور مجبور نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو خود اس کی بزدلی اور نامردی ہی اسے مظلومی کے مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ دفاع ایک نازک عمل ہے۔ اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات دفاع کے نام پر ظلم و زیادتی اور ناحق کشت وخون ہونے لگتا ہے اور اس کے متعینہ حدود و قیود کا پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا۔ جب یہ عمل اسلام کے نام پر ہوتا ہے تو اسے دنیا ظلم، تشدد اور دہشت گردی قرار دے کر اسلام ہی کو بدنام کرنے لگتی

ہے اور دفاع کا جائز حق بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اسلام نے، اس میں شک نہیں، دفاع کا حق ہر شخص کو دیا ہے، لیکن ظلم کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے۔ اس کی تعلیم ہے کہ انسان نہ تو خود کسی پر ہاتھ اٹھائے اور نہ کسی دوسرے کو اپنے اوپر دست درازی کی اجازت دے، ظالم کے سامنے سپر نہ ڈالے بلکہ پامردی سے اس کا مقابلہ کرے۔ وہ اس بزدلی اور دوں ہمتی کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی دست بستہ اپنی جان، مال اور عزت و آبرو سب کچھ دشمن کے حوالہ کردے اور کوئی مزاحمت نہ کرے، لیکن اس کے لیے اس نے ایسی شرائط اور ایسے حدود و قیود رکھے ہیں جو سراسر عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔ اسلامی شریعت کے ماہرین نے ان کے پیش نظر بڑی باریک بینی سے دفاع کی تفصیلات مرتب کی ہیں۔

دفاع کے معاملہ میں طرح طرح کے شبہات اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس لیے اس پر الگ سے بحث کی جارہی ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ گفتگو انفرادی اور شخصی دفاع کی ہے۔ ایک ریاست اور دوسری ریاست کے درمیان جنگ زیر بحث نہیں ہے۔ اس کے احکام دوسرے ہیں۔

دفاع میں جان دینا شہادت ہے

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں صاف اور صریح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ انسان اپنے دین و ایمان، جان و مال، مکان، زمین، جایداد، بیوی بچوں اور خویش و اقارب کی حفاظت میں جان بھی دے سکتا ہے اور یہ جان دینا شہادت ہے۔ شہادت وہ رتبۂ بلند ہے جو خوش قسمت انسانوں کو ملتا ہے۔

حضرت سعید بن زیدؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں:

من قتل دون مالہ فھو شھید ومن قتل دون دینه فھو شھید و من قتل دون دمه فھو شھید و

جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو

من قتل دون اهله فهو شهيد [۱] اپنے گھر والوں کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ اگر کوئی شخص میرا مال چھینے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: اپنا مال اسے مت دو۔ اس نے کہا اگر وہ مقابلہ پر اتر آئے؟ آپ نے فرمایا تم بھی مقابلہ کرو۔ اس نے عرض کیا اگر وہ مجھے مار ڈالے؟ ارشاد فرمایا "شہادت پاؤ گے" اس نے کہا اگر میں اسے قتل کردوں؟ فرمایا "وہ جہنم میں جائے گا۔" [۲]

انسان اپنی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے آخری حد تک کوشش کرے گا۔ وقت ضرورت اس کے لیے پاس پڑوس کی، معاشرہ کی اور حکومت کی مدد بھی حاصل کرے گا۔ چناں چہ نسائی وغیرہ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ اگر کچھ لوگ میرا مال چھیننا چاہیں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا انھیں اللہ کا حوالہ دو اور سمجھاؤ۔ اس نے عرض کیا۔ اس پر بھی اگر وہ نہ مانیں تو کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا آس پاس کے مسلمانوں سے ان کے خلاف مدد طلب کرو۔ اس نے کہا اگر قریب میں کوئی مسلمان نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا حکومت سے مدد لو۔ اس نے عرض کیا اگر حکومت تک میں پہنچ نہ سکوں تو پھر کیا کروں؟ آپ نے فرمایا اپنے مال کی حفاظت کے لیے تنہا کھڑے ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ یا تو تمھاری جان چلی جائے اور تمھارا شمار شہیدوں میں ہو جائے یا تمھارا مال محفوظ رہے۔ [۳]

ان احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ آدمی اپنی جان، مال، عزت و آبرو، بیوی بچوں اور اپنے دین و ایمان کے دفاع کی کوشش میں جان بھی دے سکتا ہے اور یہ جان دینا شہادت ہے۔ یہ دفاع کرنے والے کا انجام ہے۔ اس کے برعکس اگر حملہ آور مارا

۱۔ ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء فی من قتل دون ماله فهو شهيد۔ نسائی، کتاب المحاربة۔ ابو داؤد، کتاب السنة، باب فی قتال اللصوص.
۲۔ مسلم، کتاب الایمان، باب الدليل على ان من قصد اخذ مال غيره الخ.
۳۔ نسائی، کتاب المحاربة (تحريم الدم) باب ما يفعل من تعرض لما له.

جائے تو جہنم کا مستحق ہے۔ یہ جذبہ اگر پیدا ہو جائے تو انسان ظلم کے سامنے کبھی جھک نہیں سکتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ جس شخص کے اندر یہ جذبہ ہو اس پر دست درازی کی کوئی ہمت بھی آسانی سے نہیں کرسکتا۔ علامہ شوکانی اس سلسلہ کی احادیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

و احادیث الباب مصرحة بان المقتول دون ماله و نفسه و اهله و دينه شهيد و قاتله اذا قتل فی النار لان الاول محق و الثانی مبطل[۱]

اس باب کی احادیث صراحت کرتی ہیں کہ جو شخص اپنے مال، جان، اہل و عیال اوردین کی خاطر قتل کیا جائے وہ شہید ہے، اس کا قتل کرنے والا دوزخ میں جائے گا، اس لیے کہ پہلا شخص حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔

دفاع ایک قانونی حق ہے

دفاع کا حق اسلام کے نزدیک ہر شخص کا ایک قانونی حق ہے۔ اس سے کوئی بھی شخص اسے باز نہیں رکھ سکتا۔ فقہاء کا اتفاق ہے کہ دفاع کے سلسلہ میں حملہ آور کا جو نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری دفاع کرنے والے پر عائد نہ ہوگی۔ اسے نہ تو کسی قسم کی سزا دی جائے گی اور نہ کوئی تاوان اسے ادا کرنا پڑے گا۔ محدث ابن بطّال کہتے ہیں۔ حدیث میں جب یہ کہا گیا ہے کہ دفاع کرنے والا اگر جان دے دے تو شہید ہے، اس سے از خود یہ بات نکلتی ہے کہ اگر وہ حملہ آور کو قتل کر دے تو (جس طرح مجاہد سے دیت یا قصاص نہیں لیا جاتا اسی طرح) اس سے بھی قصاص یا دیت نہیں لی جائے گی[۲]

---

[۱] شوکانی، نیل الاوطار: ۶ / ۷۵

[۲] ابن حجر، فتح الباری: ۵ /۷۶، لیکن یہ استدلال کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک شہید تو وہ ہے جو اللہ کے راستہ میں اس کے دشمنوں سے لڑ کر جان دیتا ہے۔ اسے شہادت کا اجر وثواب بھی حاصل ہوگا اور شہید کے سلسلہ کے احکام کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ جیسے اسے غسل نہیں دیا جائے گا وغیرہ۔ ایک شہید وہ ہے جسے شہادت کے ثواب کی بشارت تو دی گئی ہے لیکن دنیوی احکام اس کے وہ نہیں ہیں جو پہلی قسم کے شہید کے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی، شرح مسلم جلد۱، جز ۲، ص ۱۴۰) اس لیے دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک دفاع کرنے والے کے حق کا تعلق ہے اس پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ آگے تصریحات آرہی ہیں۔

اپنی ذات کا دفاع

امام شافعی فرماتے ہیں: کسی کی جان، مال اور بیوی بچوں پر حملہ ہوتو اسے دفاع کا حق ہے۔ اگر اس کے نتیجہ میں حملہ آور قتل ہو جائے تو دفاع کرنے والے پر دیت یا کفارہ واجب نہ ہوگا۔[۱]

فقہ حنفی میں ہے کہ اگر کوئی شخص قتل کے ارادے سے کسی پر تلوار اٹھائے اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ ہو کہ حملہ آور کو قتل کردے تو اسے وہ قتل کرسکتا ہے۔ اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ فقہ حنفی میں مزید کہا گیا ہے کہ کسی مسلمان پر تلوار اٹھانا گویا مسلمانوں کی جماعت پر تلوار اٹھانا ہے۔ جس طرح جماعت پر تلوار اٹھانے والے کو قتل کیا جاسکتا ہے اسی طرح فرد پر تلوار اٹھانے والے کو بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔[۲]

حملہ آور کوئی فرد ہوتو جس طرح دفاع کا حق ہے اسی طرح کوئی گروہ حملہ کرے تو بھی یہ حق حاصل رہے گا۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

اگر ڈاکو کسی کی جان لینا چاہیں تو وہ ان کا مقابلہ کرے گا، چاہے اسے اپنے دفاع میں انھیں قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس پر سب کا اجماع ہے۔[۳]

کیا اپنی ذات کا دفاع واجب ہے؟

کیا یہ محض ایک قانونی حق ہے کہ آدمی اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل بھی کرسکتا ہے یا اس کے لیے ضروری ہے کہ حملہ آور کو قتل کیے بغیر اپنا دفاع نہ کرسکے تو حملہ آور کو قتل کردے؟ فقہ حنبلی میں اسے ایک حق کہا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ آدمی اپنے اس حق

۱۔ ابن حجر، فتح الباری : ۵/۷۶

۲۔ علاء الدین و ابن عابدین، رد المحتار مع الدر المختار: ۵/۴۸۱

۳۔ فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۳۴/۲۴۲ ۔ طبع جدید

کو لازماً استعمال کرے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

اپنی جان اور مال کے دفاع کا انسان کو حق حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اگر وہ حملہ آور کو مجبوراً قتل بھی کردے تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا لیکن جان و مال کا دفاع واجب نہیں ہے۔[1]

لیکن امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

اپنی ذات کے دفاع کو واجب بھی کہا گیا ہے اور عدم وجوب کے بھی لوگ قائل ہیں۔ امام احمدؒ سے دونوں ہی رائیں منقول ہیں۔[2]

احناف کے نزدیک جان کا دفاع واجب ہے۔ حملہ آور کو قتل کر کے آدمی اپنی جان بچا سکتا ہو تو اس کا قتل کرنا واجب ہے۔ ورنہ آدمی گناہ گار ہوگا۔[3]

مال کا دفاع

جان کے دفاع کی طرح مال کے دفاع کا بھی ہر شخص کو قانوناً حق حاصل ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک چور کو دیکھا تو تلوار کھینچ لی۔ راوی کا بیان ہے کہ اگر ہم انھیں چھوڑ دیتے اور قتل سے باز نہ رکھتے تو اسے وہ قتل کر ہی ڈالتے۔

حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے پوچھا اگر میرے گھر چور گھس آئے اور اس کے ہاتھ میں لوہا (ہتھیار) ہو تو کیا میں اسے قتل کردوں؟ انھوں نے جواب دیا ہاں! جس طرح بھی تم اسے قتل کرسکو کردو۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں اگر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تمھاری جان یا تمھارا مال لینا چاہے تو تم اپنی جان اور مال کی حفاظت میں اس سے قتال کرو۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱۲/ ۵۳۳-۵۳۴

[2] فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۳۴/ ۲۴۲

[3] الکفایہ علی الھدایہ: ۵/ ۱۲۶۴

حضرت ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میرے علم میں فرقہ حروریہ کے لوگوں اور ڈاکوؤں سے قتال کو کسی نے گناہ سمجھ کر نہیں چھوڑا۔ یہ بات اور ہے کوئی شخص بزدلی دکھائے[1]

فقہ حنفی میں ہے کہ:

اگر رات میں کوئی شخص کسی کے گھر گھس کر مال و اسباب چرا رہا ہو یا چرانے کا ارادہ کر رہا ہو تو اسے وہ قتل کرسکتا ہے۔ اسی طرح مال و اسباب لے کر اگر وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس کا پیچھا کر کے بھی قتل کرسکتا ہے۔ اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔[2]

مال کے دفاع کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ کیا آدمی تھوڑے سے مال کے لیے بھی دفاع کرسکتا ہے یا اس کے لیے مال کی کوئی خاص مقدار ہونی چاہیے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص ناحق کسی کا مال لینا چاہے تو اسے وہ قتل (بھی) کرسکتا ہے۔ چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ، اس لیے کہ احادیث میں اس طرح کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ الفاظ عام ہیں۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ امام مالک کے بعض تلامذہ نے کہا ہے مال اگر تھوڑا ہو تو چھیننے والے کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو جمہور نے کہی ہے[3]

فقہ حنفی میں ایک رائے یہ ہے کہ مال دس درہم یا اس سے زیادہ قیمت کا ہونا چاہیے۔ ایک دوسری رائے میں مال اتنا ہو جس سے نصاب واجب ہو جائے تو آدمی اسے بچانے کے لیے حملہ آور کو وقت ضرورت قتل بھی کرسکتا ہے۔ اس سے کم ہو تو وہ حملہ آور کا مقابلہ تو کرسکتا ہے کہ لیکن اس کی جان لینا صحیح نہیں ہے۔ لیکن احناف کے ہاں

---

[1] ابن قدامہ، ۱۲، المغنی : ۱۲/۵۳۱-۳۳۵

[2] جصاص، احکام القرآن: ۲/۴۰۔ مرغینانی، ھدایہ: ۴/۵۶۵، ابن عابدین رد المحتار: ۵/۴۸۲

[3] نووی، شرح مسلم: جلد ۱، جزء ۲، ص ۱۴۰

بھی ترجیح اسی کو حاصل ہے کہ نصاب سے کم مال کے لیے بھی آدمی حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور اسے قتل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ احادیث میں اس طرح کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے۔[1]

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

اگر ڈاکو زبردستی کسی کا مال لینا چاہیں تو ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اسے اپنا تھوڑا سا مال بھی ان کے حوالہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ ان کو جہاں تک ہوسکے آسان طریقے سے بھگانے کی کوشش کرے لیکن دفاع میں ڈاکوؤں میں سے کوئی مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ صاحب مال سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔[2]

جمہور کی رائے کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ مال کی اہمیت اصلاً افراد کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے ایک شخص کے لیے دس درہم کی وہ اہمیت ہو جو دوسرے کے لیے سو درہم کی بھی نہ ہو۔

کیا مال کا دفاع واجب ہے

امام ابن تیمیہؒ اپنی سابقہ بحث ہی کے ذیل میں فرماتے ہیں:

مال کا دفاع واجب نہیں ہے، اس لیے چاہے تو وہ ڈاکوؤں سے مقابلہ کیے بغیر ہی اپنا مال ان کے حوالہ کرسکتا ہے۔[3]

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

مال کا دفاع جائز ہے واجب نہیں ہے۔[4]

بعض علماء نے مال کے دفاع کو واجب قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

۱۔ ابن عابدین، رد المحتار، ۵/ ۴۸۲

۲۔ فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۳۴/ ۲۴۳

۳۔ حوالہ سابق

۴۔ نووی، شرح مسلم، جلد ۱، جزء ۲، ص ۱۴۱

مال کے دفاع میں اگر حملہ آور سے مقابلہ کرنا پڑے تو اسے لازماً مقابلہ کرنا چاہیے۔ غالباً ان حضرات کا استدلال حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت سے ہے جس میں حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور مال اس کے حوالہ نہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔[۱]

خاندان اور بیوی بچوں کا دفاع

انسان کا معاشرے میں قریب ترین تعلق بیوی، بچوں اور خاندان والوں سے ہوتا ہے۔ ان کی بہت سی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں۔ ان پر کوئی نازک وقت آئے تو وہ اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہے اور اپنا مال لٹا سکتا ہے۔ ان کا دفاع اگر قانون کے حدود میں ہو تو اسلام نے اس کی تعریف کی ہے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔

خیرکم المدافع عن عشیرته مالم یأثم[۲]

تم میں بہتر آدمی وہ ہے جو اپنے خاندان کا دفاع کرے۔ جب تک کہ دفاع کے سلسلے میں وہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ مناویؒ کہتے ہیں:

... فیرد عنهم من ظلمهم فی مال او عرض او بدن ... مالم یظلم الدافع فی دفعه بان تعدی الحد الواجب فی الدفع[۳]

... وہ خاندان والوں کے مال، عزت و آبرو اور جسم و جان پر حملہ ہو تو اس کا جواب دیتا اور دفاع کرتا ہے ... دفاع کرنے والا اس وقت تک قابل تعریف ہے جب تک کہ وہ اس معاملہ میں حد واجب سے آگے نہ بڑھے۔

جہاں تک بیوی بچوں کے دفاع کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے، اس کے

---

۱ شوکانی، نیل الاوطار: ۶/۷۵

۲ ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی العصبیة۔ اس کے ایک راوی ایوب بن سوید کو امام ابو داؤد نے ضعیف قرار دیا ہے۔

۳ مناوی، التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/۵۳۴

بارے میں علامہ نوویؒ کہتے ہیں:

و اما المدافعة عن الحریم فواجبة بلا خلاف[1]

جہاں تک بیوی بچوں کی طرف سے دفاع کا تعلق ہے اس کے واجب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عفت و عصمت کا دفاع

عفت و عصمت بھی انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس پر حملہ ہو تو وہ آخری حد تک دفاع کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حملہ آور کو جو نقصان پہنچے گا اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوگی۔ فقہ حنفی میں ہے۔

اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زبردستی زنا کرنا چاہے اور اسے یقین ہو کہ چیخ پکار یا مار پیٹ سے وہ نہیں بھاگے گا تو اسے وہ قتل کرسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مقتول کا خون رائیگاں جائے گا۔ یہی حق کم عمر لڑکے کو بھی حاصل ہوگا جس کے ساتھ زبردستی بدفعلی کی کوشش کی جائے۔[2]

امام احمدؒ سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت پر برے ارادے سے حملہ کرے اور وہ اپنی عفت کے تحفظ کی خاطر اسے قتل کردے تو کیا حکم ہے؟ انھوں نے فرمایا اگر عورت کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کی عصمت دری چاہتا ہے تو اسے وہ قتل کرسکتی ہے۔ اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت عمرؓ کے ایک فیصلہ کا بھی ذکر فرمایا کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کرنی چاہی تو اس نے پتھر سے مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم اس کی دیت نہیں دی جائے گی۔[3]

---

[1] نووی، شرح مسلم ۱/۸۱

[2] علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۳/۲۴۸

[3] ابن قدامه المغنی: ۱۲/۵۳۳

کیا عفت وعصمت کا دفاع واجب ہے؟

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ بدکاری کرنا چاہے تو اس کے لیے دفاع واجب ہے، اس لیے کہ کسی کو عصمت دری کا موقع دینا حرام ہے۔ دفاع نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ عورت ایک طرح سے حملہ آور کو اس کا موقع دے رہی ہے۔[1]

دفاع میں تعاون

کسی کی جان، مال، عزت و آبرو یا بیوی بچوں پر حملہ ہو تو اسلام، معاشرہ کی یہ اخلاقی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ جو شخص اس حملہ کو روک سکتا ہو روکے اور مظلوم کے دفاع میں جو بھی مدد کر سکتا ہو کرے۔ اس سے آگے وہ اس کی بھی اجازت دیتا ہے کہ مظلوم کو بچانے کے لیے اگر اسے حملہ آور کی جان بھی لینی پڑے تو وہ لے سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کا ہر اقدام قانونی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

کوئی شخص کسی کی جان اور مال پر دست درازی کرے یا کسی عورت کی عصمت دری کرنا چاہے تو جس پر حملہ نہیں ہوا ہے اسے ان کو بچانے میں مدد کرنی چاہیے۔ اسی طرح اگر چور اور ڈاکو کسی قافلہ سے تعرض کریں تو جو لوگ قافلہ میں نہیں ہیں انھیں اس کی اجازت ہے کہ قافلہ والوں کا دفاع کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم“ ایک اور حدیث میں ہے کہ ”فتنہ پردازوں کے خلاف مومن ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں“ اگر (ظلم کے خلاف) ایک دوسرے کا تعاون نہ ہو تو لوگوں کی جان اور مال سب ہی کچھ لٹ سکتا ہے۔ چور اور ڈاکو کسی کا مال چھین لیں اور دوسرا اس کی مدد نہ کرے تو وہ یکے بعد دیگرے سب ہی کا مال چھین لے جائیں گے۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱۲ / ۵۳۳

اسی طرح دوسروں کا معاملہ ہے۔“[1]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے:

کوئی شخص کسی پر تلوار اٹھائے اور دوسرا شخص حملہ آور کو قتل کردے تو قانوناً اس کی گرفت نہ ہوگی۔[2]

لیکن اس کے ساتھ قانون یہ بھی دیکھے گا کہ بلا وجہ کسی کی جان نہ لی گئی ہو۔

اگر کوئی شخص حملہ کے بعد اس طرح بھاگ کھڑا ہو کہ دوبارہ اس کی طرف حملہ کا اندیشہ نہ ہو تو جس پر حملہ ہوا ہے وہ یا کوئی دوسرا فرد اسے قتل کردے تو وہ مجرم قرار پائے گا اور اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔[3]

جب کوئی شخص یہ دیکھے کہ چور کسی کے گھر سوراخ کر رہا ہے اور چیخنے چلانے کے باوجود وہ بھاگ نہیں رہا ہے تو اس کے لیے اس کا قتل کردینا جائز ہوگا۔[4]

اگر آدمی یہ دیکھے کہ کوئی شخص کسی نامحرم عورت کے ساتھ ہے اور اسے یقین ہوجائے کہ وہ شور کرنے، ڈرانے دھمکانے یا لاٹھی وغیرہ غیر مہلک ہتھیار استعمال کرنے سے عورت کو نہیں چھوڑے گا تو اسے وہ قتل کرسکتا ہے۔ لیکن اگر قتل کیے بغیر اس کا بھگانا ممکن ہو تو قتل کرنا صحیح نہ ہوگا۔[5]

یہی حکم ان بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کا ہے جن سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ کھلم کھلا اور علانیہ ظلم و زیادتی کرنے والوں کا بھی یہی حکم ہے۔ عام افراد کے لیے اس کی حیثیت جواز کی ہے اور حکومت کے لیے اس پر عمل کرنا واجب ہے۔[6]

---

[1] ابن قدامه، المغنی: ۱۲/۵۳۴-۵۳۵.

[2] علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۵/۴۸۱.

[3] حواله سابق ص ۴۸۲.

[4] حواله سابق.

[5] علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۲/۲۴۸.

[6] علاء الدین و ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۲/۲۴۹.

یہ ایک فرد کی بات تھی۔ اگر کوئی شخص کسی جگہ عام مسلم آبادی کے خلاف تلوار ٹھائے اور علانیہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع کردے تو قطع نظر اس کے کہ اس نے کس پر حملہ کیا اور کون اس کے حملہ سے محفوظ رہا یہ سب ہی کا فرض ہے کہ اسے اس سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ اس میں کسی طرح کی کامیابی نہ ہو تو اسے قتل کر دیں۔ جو شخص اسے قتل کرے اس پر دیت یا قصاص واجب نہیں ہوگی۔ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ کہتے ہیں: اس کی ایک دلیل تو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

من شهر علی المسلمین سیفاً فقد اطل دمه[1]	جس شخص نے مسلمانوں کے خلاف تلوار کھینچی اس نے اپنا خون ضائع کیا۔ (اس کی قیمت نہیں رہی)

دوسرے یہ کہ وہ اسلامی ریاست کا باغی ہے اور بغاوت کی وجہ سے وہ معصوم بالدم نہیں رہا۔ لہٰذا اس کا خون بہایا جاسکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس نے اپنے قتل پر خود ہی مجبور کر دیا کہ اس کے علاوہ جان بچانے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔[2]

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ اسلامی ریاست میں جو حکم مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے والے کا ہے وہی حکم ذمیوں پر تلوار اٹھانے والے کا بھی ہے۔[3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ذمیوں کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اگر قتل کیے بغیر اسے اس سے روکا نہ جاسکے تو ضروری ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

---

[1] یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں نہیں آئی ہے البتہ اس کی ہم معنی روایات نسائی، اسحاق، حاکم اور طبرانی وغیرہ نے نقل کی ہیں۔ نسائی کے الفاظ یہ ہیں۔ من شهر سیفه ثم وضعه فدمه هدر۔ کتاب المحاربه (کتاب تحریم الدم) باب من شهر سیفه (جس نے اپنی تلوار کھینچی اور اسے لوگوں کے درمیان خوں ریزی کے لیے استعمال کیا تو اس کا خون رائیگاں گیا) تفصیل کے لیے دیکھی جائے الدرایة فی تخریج احادیث الهدایه ص ۳۶۳

[2] مرغینانی، هدایه : ۵۶۴/۴

[3] ابن عابدین، رد المحتار: ۴۸۱/۵

دفاع کرنے والے پر حملہ آور کے نقصان کی ذمہ داری نہیں ہے

دفاع میں حملہ آور کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اس کا کوئی دوسرا نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ اگر یہ نقصان اس کے حملہ کی وجہ سے ہو تو دفاع کرنے والے سے قصاص یا دیت نہیں لی جائے گی۔

حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت ہے کہ دو اشخاص کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ایک نے دوسرے کا ہاتھ کاٹ لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ زور سے کھینچا تو کاٹنے والے کے اگلے دونوں دانت گر پڑے۔ ان کا یہ نزاع رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ جس کے دانت گرے تھے اس نے دیت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی کا ہاتھ اونٹ کی طرح چبائے تو کیا وہ خاموش ہو جائے۔ جاؤ اس کی کوئی دیت نہیں ہے۔[1]

اس حدیث سے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ وغیرہ جمہور علما نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا ہاتھ دانتوں سے کاٹے اور اسے چھڑانے کی کوشش میں اس کے دانت ٹوٹ جائیں تو چھڑانے والے پر قصاص یا دیت واجب نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اس کی نوعیت حملہ آور سے اپنے دفاع کی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کی وجہ سے کسی کے دانت ٹوٹے وہ اس کا ضامن ہوگا۔ امام مالکؒ کی تائید میں جو دلیلیں دی گئی ہیں حافظ ابن حجرؒ نے ان سب کی تردید کی ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ امام مالکؒ تک غالباً یہ حدیث نہیں پہنچی ورنہ وہ نص کے مقابلہ میں قیاس سے کام نہ لیتے۔[2]

لیکن مالکیہ میں متاخرین نے اس حدیث کا موقع و محل متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ کہا گیا ہے:

---

[1] بخاری، کتاب الدیات، باب اذا عض الرجل فوقعت ثنایاہ۔ مسلم، کتاب القسامۃ والمحاربین، باب الصائل علی نفس الانسان أو عضوہ الخ

[2] ملاحظہ ہو شرح مسلم، نووی، جلد ۶، جز ۱۱، ص ۱۳۳۔ فتح الباری ۱۲/ ۱۸۰

اگر کوئی شخص کسی کا ہاتھ دانتوں سے کاٹے اور وہ اپنا ہاتھ قصداً اس طرح کھینچے کہ کاٹنے والے کے دانت ٹوٹ پڑیں تو اس پر دیت واجب ہوگی۔ لیکن اگر وہ قصداً ایسا نہ کرے اور اس کے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ اس کے دانت ٹوٹے بغیر اپنا ہاتھ منہ سے چھڑا سکے تو اس پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ اس کی تائید میں مذکورہ بالا حدیث پیش کی گئی ہے۔[1]

یہی بات جمہور نے بھی کہی ہے۔ چناں چہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

جمہور کے نزدیک دفاع کرنے والے پر سے حملہ آور کے دانت ٹوٹنے کی ذمہ داری اس وقت ساقط ہوگی جب کہ دو شرطیں پائی جائیں۔ ایک یہ کہ حملہ آور نے دانتوں سے اس طرح کاٹا ہو کہ دفاع کرنے والے نے اس کا درد اور تکلیف محسوس کی ہو۔ دوسری شرط یہ کہ سختی سے ہاتھ چھڑائے بغیر اس کے لیے کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ حملہ آور کے منہ پر یا گال پر تھپڑ مار کر اسے نکال نہ سکے۔ اس امکان کے باوجود اس نے قصداً ہاتھ کو اس طرح چھڑانے کی کوشش کی کہ حملہ آور کے دانت گر پڑے تو اس کا اقدام معاف نہیں ہوگا۔[2]

بعض حضرات نے اس کی ایک خاص ترتیب بھی بیان کی ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے بعض دوسری الجھنیں پیدا ہوسکتی ہیں۔[3]

شوافع کے ہاں بھی ایک رائے یہ ہے کہ جو شخص کسی کو دانتوں سے کاٹ رہا ہو اسے اپنا ہاتھ کھینچنے کا مطلقاً حق حاصل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کوئی دوسرا آسان طریقہ اختیار کرسکتا ہے یا نہیں؟[4]

---

۱ احمد الدردیر، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک: ۵۰۶/۴

۲ ابن حجر، فتح الباری: ۱۸۰/۲۱   ۳ المغنی: ۵۳۹،۵۳۸/۱۲

۴ علامہ شوکانی کا بھی یہی رجحان ہے۔ نیل الاوطار ۱۷۲/۷۔ اگر کوئی شخص کسی کو دانتوں سے کاٹے تو اسے دفاع کس طرح کرنا چاہیے اس پر بحث ہوسکتی ہے۔ لیکن جہاں تک دفاع میں ترتیب کا تعلق ہے وہ بہر حال ضروری ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

جس شخص کو اس طرح دانتوں سے کاٹا جائے وہ اپنے دفاع میں کاٹنے والے کو کسی بھی جگہ چوٹ پہنچا سکتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

ولو جرحه المعضوض فی موضع آخر لم یلزمه شیء[1]

جس شخص کو دانتوں سے کاٹا گیا ہے وہ اگر کاٹنے والے کو کسی دوسری جگہ زخمی کردے تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

دانت سے کاٹنا ایک مثال ہے جس کا زیر بحث حدیث میں ذکر آیا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ حملہ کسی بھی نوعیت کا ہو آدمی کو دفاع کا حق ہے اور اس کے نتیجہ میں حملہ آور کا کوئی نقصان ہو، حتیٰ کہ اس کی جان چلی جائے تو بھی دفاع کرنے والے پر اس کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔

فیه دفع الصائل و انه اذا لم یکن الخلاص منه الا بجنایة علی نفسه او علی بعض اعضائه ففعل به ذٰلک کان هدرا[2]

اس حدیث میں حملہ آور کے دفاع کا ثبوت ہے۔ حملہ آور کی جان لیے بغیر یا اس کے کسی عضو کو نقصان پہنچائے بغیر حملہ سے بچنے کا امکان نہ ہونے کی صورت میں دفاع کرنے والا ایسا کوئی اقدام کر گزرے تو اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوگی۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں:

... کذٰلک الحکم فی ما اذا عضه فی غیر یده او عمل به عملا غیر العض افضٰی الی تلف شیء من الفاعل لم یضمنه[3]

یہی حکم ہے جب کہ وہ ہاتھ کے علاوہ کسی اور جگہ اسے کاٹے یا کاٹنے کے علاوہ کوئی ایسا اقدام کرے جس کے نتیجہ میں حملہ آور کا کوئی نقصان ہو تو دفاع کرنے والا اس کا ضامن نہ ہوگا۔

---

[1] فتح الباری، ۱۲/۱۸۰

[2] فتح الباری، ۱۲/۱۸۰

[3] المغنی، ۱۲/۵۳۸

دفاعی اقدام میں الاسہل فالاسہل کا اصول

مال کے دفاع کے سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ یہ حدیث مسند احمد میں ان الفاظ میں آئی ہے:

یا رسول اللہ أرأیت ان عدی علی مالی قال فانشد اللہ قال فان ابوا علی قال انشد اللہ قال فان ابوا علی قال فانشد اللہ قال فان ابوا علی قال فقاتل فان قتلت ففی الجنة و ان قتلت ففی النار[1]

اے اللہ کے رسول ﷺ اگر میرے مال کے ساتھ زیادتی ہو (اسے چھیننے کی کوشش کی جائے) تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا چھیننے والوں کو اللہ کا واسطہ دو۔ اس نے عرض کیا۔ اگر وہ میری بات نہ مانیں تو کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا انھیں اللہ کا واسطہ دو۔ اس نے عرض کیا، پھر بھی وہ نہ مانیں تو کیا کیا جائے؟ آپ نے (تیسری بار) فرمایا انھیں اللہ کا واسطہ دو۔ اس نے کہا اس پر بھی وہ نہ مانیں تو کیا کیا جائے۔ آپ نے فرمایا: ان کا مقابلہ کرو۔ اگر تم مارے گئے تو جنت میں جاؤ گے اور اگر تم نے اسے قتل کر ڈالا تو وہ جہنم میں جائے گا۔

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ دفاع میں الاسہل فالاسہل کے اصول پر عمل کیا جائے گا۔[2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ دفاع کی جو آسان سے آسان تدبیر ممکن ہو وہ اختیار کی جائے گی۔ یہ تدبیر ناکافی یا غیر موثر ہو تو نسبتاً سخت طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اگر یہ بھی غیر موثر یا بے سود محسوس ہو تو اس سے بھی سخت تدبیر اختیار کی جائے گی۔ اگر حملہ آور چیخ پکار سے فرار ہو سکتا ہو تو اسے لاٹھی مار کر بھگانے کی کوشش نہیں کی جائے گی یا اسے

---

[1] مسند احمد: ۲/۳۳۹۔ نسائی، کتاب تحریم الدم، باب مایفعل من تعرض لمالہ

[2] شوکانی، نیل الاوطار: ۶/۷۴

لاٹھی سے مار کر بھگایا جاسکتا ہو تو تلوار سے اسے ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ علامہ شوکانیؒ کہتے ہیں:

ینبغی تقدیم الاخف فالاخف فلا یعدل المدافع الی القتل مع امکان الدفع بدونہ ویدل علٰی ذالک امرہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم بانشاد اللّٰہ قبل المقاتلۃ[1]

دفاع کا سب سے پہلے آسان طریقہ اختیار کرنا چاہیے پھر اس کے بعد نسبتاً سخت طریقہ اختیار کیا جائے۔ جب تک قتل کے بغیر دفاع کا امکان موجود ہے، دفاع کرنے والا اقدام قتل نہیں کرسکتا۔ رسول اللہ ﷺ کا سائل کو یہ حکم دینا کہ قتال سے پہلے وہ حملہ آور کو اللہ کا واسطہ دے، اسی کی دلیل ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے مکان میں گھس پڑے اور صاحب مکان کے للکارنے اور شور مچانے سے وہ نکل جائے تو صاحب مکان کو اس کی جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے کہ مقصود صرف یہی ہے کہ وہ مکان سے چلا جائے۔ اسی طرح اگر یہ معلوم ہو کہ لاٹھی اور ڈنڈے کے استعمال سے وہ بھاگ کھڑا ہوگا تو مہلک ہتھیار کے استعمال کی اسے اجازت نہ ہوگی۔ اگر حملہ آور کو زخمی کرکے بے کار کردیا جائے اور وہ حملہ کے قابل نہ رہے تو اس کو قتل کرنے کا حق نہ ہوگا (اس احتیاط کے باوجود) مقابلہ میں حملہ آور مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ دفاع کرنے والا اس کا ذمہ دار نہ قرار پائے گا، اس لیے کہ اس صورت میں گویا حملہ آور نے خود ہی صاحب مکان کو اس پر مجبور کیا تھا کہ اسے قتل کردیا جائے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔[2]

فقہ حنفی میں ہے کہ اگر رات میں کوئی شخص کسی کے گھر گھس کر اس کا مال و اسباب لوٹنا چاہے تو اسے وہ قتل کرسکتا ہے۔ اسی طرح مال و اسباب لے کر بھاگے تو اس

---

[1] شوکانی، نیل الاوطار: ۶/ ۷۵

[2] تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ المغنی: ۱۲/ ۵۳۱-۵۳۲

کا پیچھا کر کے بھی قتل کرسکتا ہے، بشرطے کہ قتل کے سوا مال کے واپس لینے کی کوئی صورت نہ ہو۔[1]

یہی بات ان الفاظ میں بھی کہی گئی ہے:

هذا اذا لم يعلم انه لو صاح عليه طرح ماله و ان علمه ذلك فقتله مع ذلك وجب عليه القصاص[2]	چور کا قتل کرنا اس وقت اس کے لیے صحیح ہوگا جب کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اس کے شور وغل مچانے سے چور اس کا مال پھینک دے گا لیکن اگر یہ جاننے کے باوجود اسے وہ قتل کردے تو اس پر قصاص واجب ہو جائے گا۔

اسلامی ریاست میں جو شخص مسلمانوں یا ذمیوں کے خلاف تلوار اٹھائے اس کا حکم اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس ذیل میں فقہ حنفی میں کہا گیا ہے۔

ويجب دفع من شهر سيفاً على المسلمين ولو بقتله ان لم يمكن دفع ضرره الا به	جو شخص مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھائے اس کا دفع کرنا ضروری ہے، چاہے اس کے لیے اسے قتل کرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ بشرطے کہ کسی اور طریقہ سے اس کے ضرر کو دفع کرنا ممکن نہ ہو۔

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اصلاً دفع ضرر واجب ہے۔ نہ کہ کسی کو قتل کرنا اور جان لینا۔ اگر کسی کی جان لیے بغیر بھی دفع ضرر ممکن ہو تو اس کی جان ہرگز نہیں لی جائے گی۔ یہ اقدام صرف مجبوری ہی میں ہوسکتا ہے۔[3]

کسی بھی اقدام کا فیصلہ حالات کے تحت ہوگا

یہ بات کہ کس وقت کون سا دفاعی اقدام صحیح اور قانون کے تحت ہوگا اور کون سا اقدام غلط اور غیر قانونی قرار پائے گا اس کا فیصلہ حملہ کی نوعیت اور ان حالات کے

---

[1] مرغینانی، ہدایہ: ۴/ ۵۶۵

[2] ابن عابدین، رد المحتار: ۵/ ۴۸۶

[3] ابن عابدین، رد المحتار مع در المختار: ۵/ ۴۸۱

پیش نظر ہوگا جن میں حملہ ہوا ہے۔

اگر کوئی شخص جان لینے کے ارادے سے کسی پر تلوار اٹھائے (یا کوئی مہلک ہتھیار استعمال کرے) تو اسے اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل کرنے کا حق ہے، خواہ حملہ آبادی میں ہو یا غیر آباد جگہ میں، رات میں ہو یا دن میں، اس لیے کہ اس میں تاخیر سے اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن اگر لاٹھی یا چھڑی یا کسی غیر مہلک ہتھیار سے حملہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ حملہ کہاں ہوا ہے اور کس وقت ہوا ہے؟ اگر حملہ آبادی میں ہو اور دن میں ہو تو اسے حملہ آور کو قتل کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ مدد کے لیے دوسروں کو بلا سکتا ہے اور مدد کے پہنچنے تک اس کی جان جانے کا خطرہ نہیں ہے۔ لیکن اگر حملہ رات میں اور کسی سنسان جگہ میں ہو تو اسے اپنے دفاع میں حملہ آور کو قتل کرنے کا حق ہوگا، اس لیے کہ وہاں کسی مدد کا پہنچنا مشکل ہے۔ لاٹھی یا ڈنڈا اس قسم کا ہو کہ اس سے موت واقع ہو سکتی ہو تو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے بہ قول یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ حملہ رات میں ہوا ہے یا دن میں؟[1]

مال کے دفاع میں کسی چور اور ڈاکو کو اسی وقت قتل کیا جا سکتا ہے جب کہ (قرائن سے) یہ معلوم ہو کہ چیخنے چلانے سے وہ مال چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ڈرانے دھمکانے اور شور مچانے سے بھاگ کھڑا ہوگا اسے قتل کر دیا جائے تو قاتل پر قصاص واجب ہوگا۔[2]

دفاعی اقدام کے لیے ثبوت چاہیے

کسی بھی دفاعی اقدام کے لیے ثبوت کا پایا جانا ضروری ہے۔ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں:

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں شخص اس کے گھر گھس آیا تھا اور اسے قتل

---

[1] مرغینانی، ہدایہ: ۴/ ۵۶۴

[2] درالمختار مع ردالمختار: ۵/ ۲۸۲

کیے بغیر اسے بھگانے کی کوئی صورت نہیں تھی تو بغیر ثبوت کے اس کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اس بات سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مقتول چوری اور مکاری میں مشہور تھا یا نہیں؟ گواہوں کو اس امر کی گواہی دینی ہوگی کہ انھوں نے مقتول کو معروف قسم کے ہتھیار (جن سے کسی کی جان لی جاسکتی ہے) لے کر قاتل کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھا اور قاتل نے اسے اپنے دفاع میں قتل کیا۔ لیکن اگر گواہوں نے یہ گواہی دی کہ ہم نے اس شخص کو محض اس کے گھر جاتے دیکھا اور اسلحہ کا ذکر نہیں کیا یا اسلحہ کا ذکر کیا مگر مشہور اسلحہ کا ذکر نہیں کیا تو اس سے قصاص ساقط نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آدمی کسی کے گھر کسی بھی ضرورت سے داخل ہوسکتا ہے۔ محض کسی کے گھر داخل ہو جانے سے اس کا خون بہانا جائز نہیں ہو جاتا۔[1]

لیکن ایسے حالات ہوسکتے ہیں جن میں عینی شاہد موجود نہ ہوں۔ اگر اس اندیشہ سے کہ گواہی دینے والا کوئی موجود نہیں ہے آدمی دفاع نہ کرے تو اس کی جان اور مال کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ فقہ حنفی میں اسے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اگر آدمی اس بات کا ثبوت فراہم کردے کہ جو شخص گھر میں گھس آیا تھا اس نے اس سے رد و کد کی اور مقابلہ کیا تو اس کا اسے قتل کرنا صحیح ہوگا۔ اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ یہ ثبوت فراہم نہ کرسکے تو دیکھا جائے گا کہ جس شخص کو اس نے قتل کیا ہے وہ شر و فساد میں مشہور تھا یا نہیں؟ اگر وہ اس حیثیت سے مشہور نہیں تھا تو صاحب مکان سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس پہلو سے مشہور تھا تو بھی قیاس یہی کہتا ہے کہ اس سے قصاص لیا جائے، لیکن استحسان یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قاتل سے دیت دلوائی جائے۔ کیوں کہ حالات نے قصاص کے بارے میں تو شبہ میں ڈال دیا ہے۔ لیکن کم از کم دیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔[2]

---

[1] المغنی: ۱۲/۵۳٦، ۵۳۷

[2] ابن عابدین، رد المحتار: ۵/ ۴۸۲

اگر دو آدمی لڑ کر ایک دوسرے کو زخمی کردیں اور ہر ایک یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اپنے دفاع میں دوسرے کو زخمی کیا ہے تو ابن قدامہ حنبلیؒ کہتے ہیں کہ دونوں سے کہا جائے گا کہ وہ مخالف کے دعویٰ کے غلط ہونے پر قسم کھائیں۔ جب وہ قسم کھائیں تو جس کو زخم لگا ہے اس کا ضمان دوسرے پر واجب ہوگا۔ اس لیے کہ دونوں میں سے ایک جو دعویٰ کر رہا ہے دوسرا اس کا منکر ہے۔ جب کہ اصل اس کا عدم وجود ہے۔[1]

دفاعی اقدام حملہ کے وقت ہوگا

دفاع کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس وقت حملہ ہو اسی وقت دفاع ہوتا ہے۔ حملہ کے بعد دفاع کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

اگر کوئی شخص حملہ کر کے اس طرح پیچھے ہٹ جائے کہ دوبارہ اس کے حملہ کرنے کا اندیشہ نہ ہو اس کے بعد جس پر حملہ ہوا ہے وہ یا کوئی دوسرا شخص آگے بڑھ کر اسے قتل کردے تو قاتل پر قصاص واجب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جوں ہی حملہ آور پیچھے ہٹا اور حملہ سے باز آ گیا تو جیسے وہ پہلے معصوم الدم تھا دوبارہ معصوم الدم ہوگیا۔ اس کے خون بہانے کا حق نہیں ہے۔[2]

البتہ پیچھے ہٹنے کے باوجود اگر وہ تلوار لیے ہوئے ہے (اور اس کے دوبارہ حملہ کرنے کا اندیشہ ہے) تو اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔[3]

خلاصۂ بحث

اس طرح اسلام مظلوم کے اندر یہ عزم و حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی جان، مال، عزت آبرو، بیوی، بچوں، اہل خاندان اور اپنے دین وایمان کو دوسروں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑے، بلکہ جور وتعدی جس طرف سے بھی ہو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ وہ

---

[1] المغنی: ۱۲/ ۷/ ۵۳

[2] ہدایہ: ۴/ ۵۶۵

[3] ابن عابدین، در المختار مع رد المحتار: ۵/ ۴۶۲

معاشرہ کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ظلم کے دفاع کے لیے خود بھی کھڑا ہو، دفاع میں مظلوم کا ساتھ دے اور ظلم کو مٹانے اور مظلوم کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ پھر یہ کہ ظلم کے روکنے کے لیے مظلوم اور اس کے ساتھ پورا معاشرہ جو قدم اٹھائے اسے وہ قانوناً سندِ جواز عطا کرتا ہے تاکہ وہ کسی وقت بھی قانونی لحاظ سے خود کو بے بس اور مجبور نہ محسوس کرے۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کی بھی نگرانی کرتا ہے کہ خود مظلوم کسی مرحلہ میں ظالم نہ بننے پائے اور دفاع کے نام پر ظلم نہ کرنے لگے۔

مذہب کی آزادی کا حق

- عقیدہ اور مذہب کے لیے جبر کی اجازت نہیں ہے
- اللہ کے رسولوں کا احترام
- ذمیوں کے حقوق
- شخصی قوانین پر عمل کا حق
- مذہب پر گفتگو ہو سکتی ہے
- مذہب پر گفتگو کے حدود

مذہب کی آزادی کا حق

اسلام نے انسان کو جو حقوق دیے ہیں ان کے ذیل میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے؟ اس سوال کو بعض اوقات اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ اسلامی ریاست میں اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور انھیں بہ جبر اسلامی احکام کا پابند بنایا جائے گا۔ یہاں اس مسئلہ میں اسلام کے موقف کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

عقیدہ اور مذہب کے لیے جبر کی اجازت نہیں ہے

اسلام اس حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ اب دنیا میں وہی واحد دین حق ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں گو وہ صداقت سے خالی نہیں ہیں، ان میں سچائی کا عنصر ہوسکتا ہے اور ہے، لیکن وہ حق و باطل کا مجموعہ ہوکر رہ گئے ہیں، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے اپنے اس موقف کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا ہے، بلکہ اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کی آزادی عطا کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اندر یہ فطری خواہش تھی کہ سب لوگ اسلام کو اللہ کے دین کی حیثیت سے قبول کرلیں لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا کہ آپ کی یہ خواہش پوری نہیں

ہوسکتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف ہے۔ وہ چاہتا تو خود ہی سب کو بہ زور و جبر اپنے دین کا پابند بنا دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ اس کے دین کو چاہے قبول کرے یا نہ کرے۔ جب اس نے آزادی دی ہے تو کوئی بھی شخص اسے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

(یونس:۹۹)

اگر تمھارا رب چاہتا تو زمین کے سارے کے سارے لوگ ایمان لے ہی آتے۔ تو کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ ایمان والے ہوجائیں۔

سورۂ انعام میں یہی بات اور پرزور انداز میں کہی گئی ہے۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؔؕ وَ الْمَوْتٰى یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

(الانعام:۳۵،۳۶)

اگر تم پر ان کا اعراض کرنا شاق گزرے تو تم سے ہوسکے تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرو یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لے آؤ۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم ہرگز نادانوں میں سے نہ بنو۔ ہماری باتیں وہی مانیں گے جو سنتے ہیں، باقی جو مردہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کو (قیامت میں) اٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

اس کا واضح اعلان ہے:

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت، ضلالت اور گم راہی سے الگ واضح ہوچکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے

لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶ (البقرۃ:۲۵۶)
مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ جب اس نے دین ومذہب کے معاملہ میں جبر نہیں رکھا ہے، تو خود اس کی راہ میں بھی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ جو شخص اسے قبول کرنا چاہے آزادی سے قبول کرسکے، اس کی راہ روکنا اور اس پر بندش لگانا اس کی حریت فکر پر دست درازی ہے۔ ایک شخص دنیا کے کسی بھی نظریۂ حیات کو قبول کرنے کا حق رکھتا ہے تو معقول اور منطقی بات ہے کہ اسے اسلام کے نظریۂ حیات کو اپنانے کا بھی حق ملنا چاہیے۔ لیکن اسلام کے مخالفین اس کے بارے میں یہ رویہ نہیں اختیار کرتے اور وہ آزادیِ فکر کے حق کو پامال کرتے اور جبر کے تالے انسانوں پر لگاتے ہیں۔ ایک ہی معاملہ میں دو الگ الگ پیمانے اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اسلام نے کہا کہ یہ جبر اور بندش اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت ناروا اور مذموم ہے۔ اس کی پکڑ سے وہ قیامت کے روز بچ نہیں سکتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝۱۶۷ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝۱۶۸ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۶۹ (النساء:۱۶۷-۱۶۹)

بے شک جن لوگوں نے خود کفر کی روش اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکا وہ گم راہی میں بہت دور جا پڑے۔ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور (اہل ایمان پر) ظلم کیا اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ اور انھیں جہنم کے راستہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں دکھائے گا۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔

قرآن مجید نے پیغمبروں اور خدا پرست انسانوں کی تاریخ پیش کی ہے کہ انھیں اللہ کے دین کے مطابق عمل کرنے اور اسے اللہ کے بندوں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ انھیں دعوت وتبلیغ کا حق دینے سے انکار کیا گیا اور مخاطبین کو اس

کے قبول کرنے سے بہ جبر روکنے کی کوشش کی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت حق ہی کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے قتل کا باہم مشورہ ہونے لگا تو اللہ کے ایک بندہ نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ (مومن:۲۸)

کیا تم قتل کرو گے ایک ایسے شخص کو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ جب کہ وہ تمھارے رب کی طرف سے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہوگا اور اگر وہ سچا ہے تو جس (دنیا و آخرت کے) عذاب کی وہ وعید سنا رہا ہے۔ اس کا ایک حصہ تم پر آئے گا۔ بے شک اللہ راہ نہیں دکھاتا اس شخص کو جو حد سے گزر جانے والا اور انتہائی جھوٹا ہے۔

حضرت موسیٰؑ ہی کی تاریخ کا واقعہ ہے کہ ان کی دعوت اور ان کے معجزات کے مقابلے کے لیے جادوگر بلائے گئے۔ لیکن جلد ہی جادوگروں پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ حضرت موسیٰؑ حق پر ہیں، ساحرانہ کرتبوں کے ذریعہ ان کے معجزات کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ اس پر فرعون طیش میں آگیا اور اس کی آتشِ غضب اس قدر بھڑک اٹھی کہ اس نے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دینے اور سولی پر چڑھا دینے کا حکم جاری کر دیا۔ اُن اللہ کے بندوں نے سب کچھ صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کیا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ ۚ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ۧ (الاعراف:۱۲۵،۱۲۶)

انھوں نے کہا ہمیں تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے۔ تم محض اس بات پر انتقام لے رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی آیات پر، جب وہ ہمارے سامنے آئیں، ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! ہم پر صبر نازل فرما اور ہم کو اپنے فرماں بردار کی حیثیت میں وفات دے۔

قرآن مجید نے اصحاب اخدود کا ذکر کیا ہے کہ انھیں محض اس جرم میں دہکتی آگ میں پھینک دیا گیا کہ اللہ واحد پر، جو زمین و آسمان کا مالک ہے، وہ ایمان رکھتے ہیں:

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ هُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ﴿۷﴾ وَ مَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ؕ﴿۹﴾ (البروج:۴-۹)

مارے گئے خندق (کھودنے) والے، جس میں بہت سے ایندھن کی آگ تھی۔ جب کہ وہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اہل ایمان کے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ان اہلِ ایمان سے محض اس وجہ سے انتقام لیا کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو غالب اور ستودہ صفات ہے، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی ملکیت ہے اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

اصحابِ کہف جو چند نوجوان تھے انھیں اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے ایمان کا اظہار کریں، وہ بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی قدرت سے اس غار میں کئی سو سال تک سلائے رکھا۔ جب وہ اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوئے تو کہنے لگے کہ ہم میں سے ایک آدمی احتیاط کے ساتھ بازار جائے اور کھانے کی کوئی چیز لے آئے۔ اس احتیاط کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں:

اِنَّهُمۡ اِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ يَرۡجُمُوۡكُمۡ اَوۡ يُعِيۡدُوۡكُمۡ فِىۡ مِلَّتِهِمۡ وَلَنۡ تُفۡلِحُوۡۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ (الکہف:۲۰)

اگر وہ تم پر قابو پالیں تو وہ تمھیں سنگ سار کر کے چھوڑیں گے یا تمھیں اپنے دین میں لوٹا لے جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو تم کبھی فلاح نہ پاؤ گے۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کن نازک حالات سے گزر رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ کس قدر سخت رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اسلام اس طرزِ عمل یا Persecution کا مخالف ہے۔

اللہ کے رسولوں کا احترام

اس دنیا میں جب سے انسان کا وجود ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی و رسالت کا سلسلہ جاری ہے۔ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ ہر زمانے اور ہر قوم میں اللہ کے رسول آتے رہے ہیں۔ ارشاد ہے:

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّ نَذِيرًا ۚ وَ إِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ (فاطر:۲۴)

بے شک ہم نے آپ کو دین حق کے ساتھ خوش خبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّمَآ أَنْتَ مُنْذِرٌ ۖ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾ (الرعد:۷)

آپ تو بس لوگوں کو (غلط روی کے انجام سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم میں ایک راہ نما گزرا ہے۔

ان میں سے بعض کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور بعض کا نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ (المومن:۷۸)

ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں۔ ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ کو سنایا ہے اور بعض کا آپ کو نہیں سنایا۔

یہی بات سورۂ نساء میں بعض انبیاء کے ذکر کے بعد کہی گئی ہے (النساء:۶۴)

قرآن مجید کی رو سے ایک مسلمان کے لیے اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان رکھنا اور ان کو برحق ماننا ضروری ہے۔ جن رسولوں کا قرآن نے نام بہ نام ذکر کیا ہے وہ اسی تفصیل اور تعیین کے ساتھ ان کے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہے اور جن کے رسول ہونے کی قرآن نے صراحت نہیں کی ہے، ان پر اجمالی ایمان رکھتا ہے۔

اللہ کے رسولوں کی جو اصل تعلیمات تھیں، قرآن ان کی تائید اور تصدیق کرتا ہے اور جن تعلیمات میں تحریف ہوگئی ہے ان کی اصلاح کرتا ہے۔

ایک مسلمان اپنے ایمان اور عقیدے کے لحاظ سے کسی بھی پیغمبر کی توہین کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔[۱]

ذمیوں کے حقوق

اسلامی ریاست ذمیوں (غیر مسلم رعایا) کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ان کے ساتھ زیادتی کی وہ کسی مسلم یا غیر مسلم کو اجازت نہیں دے گی۔ ان پر کسی طرف سے حملہ ہو تو اس کا دفاع کرے گی۔[۲]

اگر وہ دشمن کے قبضے میں چلے جائیں اور انھیں اس زمانے کے دستور کے مطابق غلام بنا لیا جائے تو اسلامی ریاست انھیں ان سے رہا کرائے گی اور وہ اس کے غلام نہیں بلکہ حسب سابق آزاد ہوں گے۔صحیح بخاری کے ایک باب کا عنوان ہے۔

یقاتل عن اھل الذمہ ولا یسترقون	اہل ذمہ کی طرف سے جنگ کی جائے گی اور انھیں غلام نہیں بنایا جائے گا۔

اس کی تائید میں امام بخاری نے ذمیوں سے متعلق حضرت عمرؓ کی نصیحت نقل کی ہے[۳]

علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ اس صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ذمی کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور ان کے حقوق فوت نہیں ہوں گے۔[۴]

ایک اور موقع پر کہتے ہیں:

جب کسی کے ذمی ہونے کا معاہدہ ہوجائے تو امام کے لیے اس کی حمایت کرنا ضروری ہے تاکہ مسلمان یا اہل حرب یا ذمی اس کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔[۵]

---

۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' بحث 'اسلام اور دیگر مذاہب' ص ۱۸۸، ۱۸۹۔ نیز 'اہل کتاب کے ساتھ اسلام کا رویہ' ص ۱۹۰ تا ۱۹۳

۲ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' بحث 'ذمیوں کے حقوق' ص ۲۱۵

۳ بخاری، کتاب الجہاد ۴ ابن قدامہ، المغنی: ۱۳/ ۴۹

۵ ابن قدامہ، المغنی ۱۳/ ۲۵۰

شخصی قوانین پر عمل کا حق

اسلامی ریاست میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی ہوگی۔ جن میں عبادات، نکاح و طلاق، موت و حیات اور دیگر شخصی اور عائلی امور شامل ہیں۔ان کے اِن امور میں ریاست کی مداخلت نہ ہوگی، اس کے لیے ان کی الگ عدالتیں بھی قائم کی جاسکتی ہیں۔ ہاں اگر وہ کسی معاملے میں اسلامی عدالت کی طرف رجوع کریں تو وہ ان کے قانون کے تحت نہیں بلکہ اپنے قانون کے تحت فیصلہ کرے گی۔[1]

مذہب پر گفتگو ہوسکتی ہے

دین ومذہب کی حقانیت اور صداقت پر سنجیدہ گفتگو ہوسکتی ہے۔ اس پر مباحثے اور تبادلۂ خیال کی بھی اجازت ہوگی۔ قرآن مجید نے اس معاملے میں 'جدال حسن' کی طرح ڈالی ہے۔ ارشاد ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط — ان سے بہتر طریقے سے مجادلہ کرو۔

(النحل:۱۲۵)

'جدالِ حسن' یہ ہے کہ دلائل کے ذریعہ بات ہو اور اپنے موقف کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ مذہب پر گفتگو کے عنوان سے تعصب اور نفرت کی فضا پیدا کرنا اور جنگ و جدال کا بازار گرم کرنا ممنوع ہے۔

اس حساس مسئلہ میں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مجلس میں افہام وتفہیم کی جگہ مخاطب کی طرف سے بات کو الجھانے اور اسے غلط رخ دینے کی کوشش ہونے لگے تو مجلس چھوڑ دی جائے۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث'۔ مضمون 'اسلامی ریاست میں غیر مسلموں پر اسلامی قانون کا نفاذ، ص۷۱ تا ۸۴'۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾ (الرعد:۷)

جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں الجھے چلے جا رہے ہیں، تو ان سے رخ پھیر لو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔ اگر شیطان تمھیں اس سے بھول میں ڈال دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔

مذہب پر اظہارِ خیال کے اس سے زیادہ معقول اور مہذب طریقے کا تصور بھی مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

مذہب پر گفتگو کے حدود

مذہب پر گفتگو ہو تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسولوں، اس کی نازل کردہ کتابوں اور مذہب کی معزز اور برگزیدہ شخصیتوں کا پورا احترام ہونا چاہیے۔ ان کی شان میں بدتہذیبی اور گستاخی ایک قابلِ تعزیر جرم ہے، جس کے ارتکاب پر اسلامی ریاست قانونی کارروائی کرے گی۔

غرفہ بن حارثؓ صحابیِ رسول ہیں۔ مصر کے ایک نصرانی کے پاس سے ان کا گزر ہوا جس کا نام مندقون بتایا جاتا ہے۔ انھوں نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ نبی ﷺ کی شان میں بد زبانی کرنے لگا۔ یہ بات عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (گورنر) تک پہنچائی گئی۔ اسے انھوں نے طلب کیا۔ غرفہؓ سے بھی کہا۔ ہمارا ان سے عہد و پیمان ہے، ہمیں اس کی پابندی کرنی چاہیے۔ اس پر غرفہؓ نے کہا۔ معاذ اللہ! معاہدہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ ہمیں اللہ اور رسول کے سلسلے میں اذیت پہنچائیں۔ ہم نے انھیں یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے کلیساؤں میں جو چاہیں کریں، اس میں کوئی مداخلت نہ ہوگی۔ ان پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، ان کی حفاظت کے لیے وقت ضرورت جنگ بھی کی جائے گی اور انھیں اپنے احکام پر عمل کی اجازت ہوگی۔ ہاں اگر وہ ہمارے پاس

مقدمہ لائیں تو ہم اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ عمرو بن عاصؓ نے تائید کی اور کہا آپ نے درست فرمایا[1]

علماء کا اتفاق ہے کہ اسلام یا کسی دوسرے آسمانی مذہب اور اللہ کے رسول کی توہین مسلم یا غیر مسلم کوئی بھی کرے اس کے خلاف اقدام کیا جائے گا۔ بیشتر فقہاء اس کے لیے قتل کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک پیغمبر کے سب وشتم پر قتل کی سزا نہیں ہے، البتہ کوئی شخص بار بار یہ حرکت کرے تو تعزیر کے طور پر اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔[2]

یہ سزائیں بہ ظاہر سخت معلوم ہوتی ہیں لیکن مذاہب کا احترام اور وقار باقی رکھنے کے لیے ضروری ہیں ورنہ اندیشہ ہے کہ مذہب مذاق کا موضوع بن کر نہ رہ جائے۔

مشرکین عرب رسالت کے قائل نہیں تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی۔ انھوں نے توحید کی جگہ شرک اور بت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی ہے کہ اس حساس اور نازک موضوع پر ان سے گفتگو اس ڈھنگ سے ہو کہ ان کے مذہبی جذبات مشتعل نہ ہوں، ورنہ اس کا ردعمل ہوگا اور بات اس حد تک بڑھے گی کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہی میں گستاخی ہونے لگے گی۔

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ	تم لوگ برا بھلا نہ کہو ان معبودوں کو جنھیں یہ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں کہ وہ دشمنی میں بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر قوم کو ان کے عمل آراستہ کردیے ہیں۔ پھر انھیں ان کے رب

[1] قال الهيثمي: رواه الطبراني (في الاوسط) فيه عبد الله بن صالح كاتب الليث قال عبد الملك بن سعيد بن الليث، ثقة مامون وضعفه جماعة و بقية رجاله ثقات، مجمع الزوائد و منبع الفوائد: ۵/۶۳۶۔ نیز ملاحظہ ہو: ۶/۳۹۸

[2] علامہ ابن قیمؒ نے فقہاء کے خیالات سے قرآن وحدیث کی روشنی میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو: احکام اہل الذمہ: ج ۳ ص ۱۳۵۷ تا ۱۴۵۷

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ کی طرف لوٹنا ہے۔ پس وہ انھیں بتا دے گا
(الانعام:۱۰۸) کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

اس سے یہ استدلال غلط نہ ہوگا کہ وہ مذاہب جو آسمانی مذاہب ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے یا جن کے آسمانی مذاہب ہونے کا قطعی ثبوت نہیں ہے ان کی محترم شخصیات یا ان کے معبودوں کی توہین کرنا اور ان کا مذاق اڑانا قابل تعزیر جرم قرار دیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

کتاب میں جہاں قرآن مجید کی آیات آئی ہیں، ان کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ جن کتبِ مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، حواشی میں ان کے نام، جو کتاب ایک سے زیادہ جلدوں میں ہے اس کی جلد اور صفحات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے کتاب اور مصنف کا پورا نام، سن وفات اور کتاب کے پیش نظر نسخے کے مطبع اور سن طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں ان کے مطابع وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

تفسیر:

۱- أحکام القرآن: ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی م۳۷۰ھ دارالکتب العلمیة بیروت ۱۴۱۵ھ

۲- أنوار التنزیل و أسرار التاویل: القاضی ناصر الدین البیضاوی م ۶۸۵ھ دارالکتب العلمیة بیروت ۱۹۸۸ء

حدیث:

۳- الادب المفرد: ابو عبد الله محمد بن اسمٰعیل البخاری، المطبعة السلفیة و مکتبتها القاهرة ۱۳۷۸ھ

۴- الترغیب و الترهیب: عبد العظیم بن عبد القوی المنذری م۶۵۶ھ دارالکتب العلمیة بیروت ۱۹۹۶ء

۵- جامع ترمذی: ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی م ۲۷۹ھ

۶- ریاض الصالحین: محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن الشرف النووی م۶۷۶ھ دارالثقافة العربیة، بیروت ۱۹۹۱ء

۷- سنن ابن ماجه: ابو عبد الله محمد بن یزید بن عبد الله بن ماجة القزوینی م۲۷۳ھ

۸- سنن ابو داؤد: ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی م ۲۷۹ھ

۹- سنن نسائی: ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائی م۳۰۳ھ

۱۰- شرح السنة: ابو محمد حسین بن مسعود فراء البغوی م ۵۱۶ھ

۱۱– صحیح بخاری (الجامع الصحیح): ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری م۲۵۶ھ
۱۲– صحیح مسلم: ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری م ۲۶۱ھ
۱۳– مجمع الزوائد و منبع الفوائد: حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الهیثمی م۸۰۷ھ دارالفکر، بیروت لبنان ۱۹۹۴ء
۱۴– مسند احمد: احمد بن حنبل الشیبانی ۲۴۱ھ المطبعة المیمنیة مصر ۱۳۱۳ھ
۱۵– مشکوٰة المصابیح: ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی م۷۳۷ھ یا اس کے بعد
۱۶– مؤطا امام مالک: مالک بن انس بن مالک م ۱۷۹ھ

شروح حدیث:

۱۷– التیسیر بشرح الجامع الصغیر: محمد عبد الرؤف المناوی م ۱۰۳۱ھ دارالمطبعة العامرة، مصر ۱۲۸۲ھ
۱۸– شرح صحیح مسلم: محی الدین ابو زکریا یحییٰ النووی م۶۷۶ھ دارالکتب العلمیة لبنان ۱۴۱۵ھ
۱۹– فتح الباری: شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر م۸۵۲ھ المطبعة الخیریة مصر ۱۳۲۹ھ
۲۰– نیل الاوطارشرح منتقی الاخبار: قاضی محمد بن علی بن محمد الشوکانی م۱۲۵۵ھ، ادارة الطباعة المنیریة، مصر ۱۳۴۴ھ

فقہ وفتاوٰی:

۲۱– احکام اهل الذمه: شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزیة م ۷۵۱ھ مکتبة رمادی للنشر الدمام۔ العروبة ۱۹۹۷ء
۲۲– بدایة المجتهد ونهایة المقتصد: القاضی ابو الولید محمد بن احمد ابن رشد القرطبی م۵۹۵ھ بیروت ۱۹۹۶ء
۲۳– الدر المختار شرح تنویر الابصار: محمد علاء الدین الحصکفی
مع
۲۴– رد المحتار علی الدرالمختار: محمد امین ابن عابدین م ۱۸۳۶ء مطبعة عثمانیه، مصر ۱۳۲۷ھ
۲۵– الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذهب الامام مالک: علامه احمد بن محمد الدردیر م ۱۷۸۶ء، دارالمعارف مصر ۱۳۹۲ھ
۲۶– فتح القدیر: کمال الدین محمد بن عبد الواحد السیواسی المعروف بابن الهمام

الحنفي م ١٦٨١هـ۔ المطبعة الكبرىٰ بولاق، مصر ١٣١٦هـ

۲۷– الكفاية على الهداية: جلال الدين الخوارزمي م۸۳۳ ا ء كلكته ۱۹۳۳ء

۲۸– مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیة: جمع و ترتیب عبد الرحمن بن محمد بن قاسم، دارالعربية لبنان ۱۳۹۸ھ

٢٩– المغنى على مختصر ابی القاسم الخرقی: ابو محمد عبد الله بن احمد بن قدامة المقدمی م٦٢٠هـ، هجر، قاهره ١٤١٣هـ

۳۰– الهدايه شرح البدايه (مختصر القدوری) برهان الدين ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغيناني، مطبع مجتبائی۔دهلی

سیرت و تاریخ:

۳۱– الاستيعاب فی اسماء الاصحاب: ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبی م ٤٦٣هـ، دارالكتب العلمية لبنان ۱۹۹۵ء

۳۲– الاصابة فی تمييز الصحابة: شهاب الدين ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی م٨٥٢هـ دارالكتب العلمية، لبنان ١٩٩٥ء

۳۳– الكامل فی التاريخ: ابن الاثير الجزری م ٦٢٠هـ، دارالكتب العلميه، بیروت، لبنان۱۹۹۵ء

کتاب میں مصنف کی حسب ذیل تالیفات کے حوالے دیے گئے ہیں

۳۴– اسلام میں خدمت خلق کا تصور — مولانا سید جلال الدین عمری

۳۵– عورت۔ اسلامی معاشرے میں — ,,

۳۶– عورت اور اسلام — ,,

۳۷– غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق — ,,

۳۸– مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ — ,,

۳۹– تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث — ,,

۴۰– اسلام اور وحدتِ بنی آدم — ,,

۴۱– صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات — ,,

۴۲– اسلام کا عائلی نظام — ,,

(۳۴ تا ۴۲) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

۴۳– Dr. S. Subramaniam-Human Rights: International Challenges, Two volumes, Manas Publications, New Delhi 1997

☙❧